رجسٹرڈ ایم نمبر ۱۲۶۲

بانی : ماہرالقادری

1987

ماہنامہ

فاران

کراچی

بیادِ غالب

فروری/مارچ ۱۹۸۷ء

مُدیر : اسمٰعیل احمد مینائی

بیشک آنے والا وقت تمہارے لئے بہتر ہے اس وقت سے جو گزر چکا
اور بے شک تمہارا رب ایسی نعمتوں سے تم کو نوازے گا جو تم کو خوش کردینگی۔
یہ الفاظ مبارکہ جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب
فرمائے، تمام سچے مسلمانوں کیلئے طمانیت کا پہلو رکھتے ہیں۔
آیئے ہم اللہ تعالےٰ کے حضور میں سر جھکا کر ان رحمتوں کا شکر
بجالائیں جو امتِ مسلمہ پر اب سے پہلے ہوتی رہیں اور عہد کریں کہ
آئندہ اور زیادہ عنایات کا مستحق بننے کی کوشش کرینگے۔
ایک فریضہ جو ہم پر عائد ہوتا ہے، نظام اسلام کی تعمیر ہے۔
جو بفضلہٖ تعالیٰ پاکستان میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔
نیشنل بینک اس مبارک مہم میں حسبِ توفیق شریک رہے گا۔
نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی قومی بینک
United
PID-I-19/85

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بانی: ماہر القادریؒ

ماہنامہ فاران کراچی

رجسٹرڈ ایم نمبر ۱۲۶۲

فروری/مارچ ۱۹۸۷ء

جلد ۳۸ شمارہ ۵، ۶

مدیر: اسماعیل احمد مینائی

بیادِ غالب

• قیمت فی پرچہ ۵/ روپے، خاص شمارہ ۲۰/ روپے
• چندہ سالانہ پاکستان میں: ۵۰/ روپے
• بھارت و بنگلہ دیش میں: ۱۵۰/ روپے
• دیگر ممالک میں: ۲۵۰/ روپے

دفتر۔ ماہنامہ فاران ڈی ۳۵، بلاک نمبر ۵
گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۷

فاران: ملنے کا پتہ:
○ الٰہ دین پبلی کیشنز صدر ریگل - کراچی
○ بوٹ سنز جنرل مرچنٹس و کیمسٹ
چورنگی بہادر آباد - کراچی
○ پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی
○ قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی

اس شمارے میں

اسماعیل احمد مینائی نے ایجوکیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر فاران ڈی ۳۵ بلاک ۵ گلشن اقبال کراچی سے شائع کیا فون نمبر [illegible]

نوا را تلخ تر می زن

ادب میں اباحیت کا غلبہ اور دور دورہ ہونے کے اثرات و نتائج سب کے سامنے ہیں - سب سے زیادہ خرابیاں معاشرے میں ذرائع معاش اور تصورِ معاد کے تعلق سے پیدا ہوئیں، جن کو عصرِ حاضر کا ادب اور عصرِ حاضر کی صحافت برابر ہوا دے رہے ہیں۔

اباحیت کی یہ تیز رفتاری خاص کر اس ملک میں اور ہمارے ہمسایہ ملک میں محض اتفاقی نہیں ہے - بدخواہ عناصر (بدخواہ صرف ملک و وطن ہی کے نہیں، مذہب و ملت کے عقائد و اعتقادات کے بھی) نے عمداً اور قصداً ایسے ادب کی اور ایسے ادبی رجحانات کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی جو ہمیں ہمارے ماضی سے اور اس کی بیش بہا میراث سے کاٹ دے اور بالکل بیگانہ بنا دے - اسی نے یا انہیں نے مثالیں اور تمثیلیں پیش کر کے قوم کو اس طرف مائل کیا کہ موزونیت کے چکر میں پڑے رہو گے تو دل کی بات کامیابی سے زور و قوت سے نہیں کہہ سکو گے اور سہل انگار کم سواد، سستی اور جلدی سے کیا جھٹ سے حاصل ہو جانے والی شہرت کے طلبگار طبقے نے فوراً لبیک کہا اور شاعری کا رُخ ہی بدل گیا یعنی مسلمان کسی حد تک کعبے سے پھر گیا - فرنگی کو بھی اسی میں اپنی بہبود اور عافیت نظر آئی کہ اس علاقے میں اشتراکی کو چہ گردوں کو کھلی چھٹی ملی رہے تاکہ مسلمان، مسلمان نہ رہے۔

اب جو اسے ذرا زندگی ملی تو پہلے موزونیت کو خیر باد کہا گیا پھر معنویت بر دار کیا گیا اور اس کے بعد شاعری کا کوئی معین، ناموزوں، بے معنی، تک و بے تک جو چاہا کہا جانے لگا اور لکھا جانے لگا اسی کو پہلے نیچرل شاعری کا نام دیا پھر زندگی کی ترجمان قرار دیا گیا اور بالآخر اصلی شاعری کہہ دیا۔

حسنِ خیال، حسنِ ادا اور حسنِ صوت سے

یک قلم محروم شاعری، علوئے فکر اور طہارتِ مضمون سے یکسر مبرا شاعری جس میں نہ ندرتِ بیان نہ تازگیٔ فکر، گھٹیا سے گھٹیا اور گندی سے گندی بات، بے ربطی اور بدمزاقی سے مملو، سلیقے اور سجاوٹ سے بیگانہ، اسی کو نہ صرف شاعری اور ادب قرار دیا گیا بلکہ ادبِ عالیہ کہا گیا - لفظ

کی حرمت مٹادی گئی، مفہوم و مطلب کو استعارے میں بیان کرنے کو ترک کردیا گیا اور پھر یہ ہوا کہ میراجی اور ن م راشد، حالی، حفیظ، سیماب اور سائل کے سے بڑے سخن ور اور ادیب مرگئے اور مجاز و مخدوم محی الدین، فیض و مجروح سب کا قبلہ پلک جھپکتے ہی ماسکو ہوگیا۔

غضب خدا کا اس رکیک شے کا حسرت موہانی جیسا صاحب عزم و کردار، رئیس المتغزلین بھی متاثر ہوگیا - برائی جب جڑ پکڑلے تو اسکو آسانی سے نہیں اکھاڑا جاسکتا - شاعروں اور ادیبوں کی کیمپوں کی کیمپیں عرض و طول ہند و پاک میں پھیل گیئں جن کے ذہن و فکر، قلم و قرطاس کا مزاج صرف یہ بنا کہ :-

لفظ کے معنے سے مطلب ہے نہ ماخذ سے غرض

لفظ کے معنے وہی ہیں جو میرا مفہوم ہے اور مفہوم کیا تھا، مشن کیا تھا؟ انگریز کو نکالنا نہیں - فرنگی سے نجات پانا نہیں، تثلیثی نصرانیت کو مستند کرنا نہیں۔
مفہوم و مشن تھا اور آج بھی ہے اسلام کو گدلا کرنا، مسلمان کو نا مسلمان بنانا اُمت کا شیرازہ بکھیر دینا اور نعرہ لگانا کہ :

؎ المحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار المحذر

اسمٰعیل احمد مینائی

اعلان

فاران کا آئندہ شمارہ اقبال نمبر اور مئی کا مشترکہ شمارہ ہوگا - تاکہ پرچہ باقاعدگی سے بروقت شائع ہوتا رہے۔

(ادارہ)

ماں کی ممتا، باپ کا سایہ
سر پہ ہمیشہ رکھنا خدایا

اسٹیٹ لائف نے خاندان کے مالی تحفظ کے لئے بیمہ زندگی کا ایک خصوصی منصوبہ وضع کیا ہے جس میں بامنافع میعادی پالیسی کے ساتھ حادثاتی موت کی صورت میں اضافی تحفظ اور خاندان کے لئے ماہانہ آمدنی کے اضافی معاہدے شامل ہیں۔ اس خصوصی منصوبے کے تحت بیمہ دار کی وفات کی صورت میں خاندان کے لئے فوری طور پر حسبِ ذیل ادائیگیاں کی جاتی ہیں۔

- بیمہ کی پوری رقم
- حادثاتی موت کی صورت میں بیمے کی دوگنی رقم
- تمام جمع شدہ بونس اور
- پالیسی کی باقی ماندہ میعاد تک باقاعدہ ماہانہ آمدنی

تفصیلات کے لئے اسٹیٹ لائف کے نمائندے سے رابطہ قائم کیجئے

حافظ لدھیانوی

حمد باری تعالیٰ

وہ اک ہستی جو سب پر مہرباں ہے ✣ اسی کا ہر نفس تسبیح خواں ہے

میں بندہ ہوں وہ آقا ہے یہ رشتہ ✣ خدا کے اور میرے درمیاں ہے

ہے موجودات کی ہر شے نظر میں ✣ عیاں اس پر ہے جو سب سے نہاں ہے

وہی سنتا ہے بندوں کی دعائیں ✣ اسی کا در محبت کا نشاں ہے

اسی کا ذکر ہے وجہِ تسلّی ✣ اسی کی یاد سے دل شادماں ہے

ہے سب کچھ قبضۂ قدرت میں اسکے ✣ وہی کون و مکاں کا حکمراں ہے

معطّر اس سے ہے گلزارِ عالم ✣ منقّش اس سے سطحِ آسماں ہے

جمال اس کا ہے بزمِ آب و گل میں ✣ اسی کے نور سے روشن جہاں ہے

ہے وہ موجود دل کی دھڑکنوں میں ✣ سرشکِ غم اسی کا ترجماں ہے

حرم کا راستہ ہے جادۂ نور ✣ بساطِ ارض پر یہ کہکشاں ہے

زمانے میں ہے اس کا فیض جاری
کرم سے اسکے حافظ نغمہ خواں ہے

مرزا اسد اللہ خان غالب

نعت

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ ست — آری کلامِ حق بزبانِ محمدؐ ست
آئینہ دارِ پرتوِ مہر ست ماہتاب — شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ ست
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق ست — اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ ست
ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست میخورد — سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ ست
واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار — کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ ست
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را — کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ ست

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

ترجمہ

جلوہ ہے حق کا طرزِ بیانِ محمدیؐ — ہاں ہے کلامِ حق بزبانِ محمدیؐ
سورج کی روشنی کا ہے آئینہ دار چاند — جلوہ ہے حق کی شان کا شانِ محمدیؐ
خلوت نشیں ہے ترکشِ حق میں قضا کا تیر — پرواز اس کی ہے بکمانِ محمدیؐ
کھاتے ہیں سب اسی کی قسم جو عزیز ہو — سوگند ہے خدا کی بجانِ محمدیؐ
واعظ بیانِ سایۂ طوبیٰ نہ کر، جہاں — ہو گفتگوئے سرو روانِ محمدیؐ
دو ٹکڑے ہونا چاند کا کیا چیز ہے مگر — اک جنبشِ خفیف بنانِ محمدیؐ

غالب ثنائے خواجہ کو یزداں پہ چھوڑ دے
ہے اک وہی تو مرتبہ دانِ محمدیؐ

(از افتخار احمد عدنی)

ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم

غالبؔ اور اردو اعراب

حروف آوازوں (صوتیوں) کی علامات اور ان کے نمائندے ہیں - انہیں ان آوازوں کی صحیح نمائندگی کرنی چاہیئے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ حروف کا نظام مکمل اور جامع ہو جس کے ذریعے سے زبان کی ہر آواز ٹھیک ٹھیک صحت کے ساتھ ادا کی جا سکے - حروف کے اس جامع نظام کو جس میں زبان کی نازک سے نازک آواز متشکل ہو کر سامنے آجائے اور آواز آواز میں کسی قسم کے خلط و اشتباہ کا امکان نہ رہے، صوتیاتی املا (PHONETIC - ORTHOGRAPHY) کہتے ہیں - اس کی دو قسمیں ہیں - لسانیاتی طور پر وسیع (LINGUISTIS-TICALLY - BROAD) اور لسانیاتی طور پر غیر وسیع (NARROW) ان میں سے پہلی قسم کا املا کسی قدر آسان اور مفید ہے کہ اسمیں زبان کی ہر آواز (صوتیہ) ایک مخصوص حرف سے ادا کی جاتی اور ہر حرف ایک آواز کی قائم مقامی کرتا ہے۔

اردو املا وسیع تر طرز تحریر ہے کہ اس میں ایک آواز کے لئے صرف ایک حرف اور ایک حرف کی صرف ایک آواز ہے ایک طرف ہر بنیادی آواز کی اردو تحریر میں ایک مخصوص علامت ہے جو اپنی آواز کو ظاہر کرتی ہے - دوسری طرف ضمنی یا فرعی آوازیں جو کسی ایک بنیادی آواز کے تحت آتی ہیں جدا جدا حرفوں کی جگہ تنہا ایک حرف سے، جو بنیادی آواز کے لئے مخصوص ہے ادا کی جاتی ہیں مثلاً اردو کے سادہ مصوتوں یعنی حرکات کو لیجئے - زیر - زبر - پیش اردو کی تین بنیادی حرکات ہیں جن میں سے ہر ایک کی ایک تحتی شکل بھی ہے - "اعتماد" کے الف (نیز "ت") کا زیر، "احمد" کے الف کا زبر اور "مہرہ" کے میم کا پیش بترتیب "اس" کے الف کے زیر، "امر" کے الف کے زبر اور "اُستاد" کے الف کے پیش سے مختلف ہے - پہلی تین حرکتیں بعد کی تین حرکتوں کی ضمنی فرعی یا تحتی شکلیں ہیں جنہیں "اے" (یائے لین)، "اے" (یائے مجہول)، اور "او" (واو مجہول)

کی ترشی ہوئی اور خفیف شکلیں ہونے کے باعث کسرۂ خفیفہ، فتحۂ خفیفہ اور ضمۂ خفیفہ کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں زیر، زبر، پیش کے لئے علامات رکھی گئی ہیں۔ ان ضمنی شکلوں کی کوئی علامت نہیں۔ انہیں زیر، زبر، پیش ہی کی مدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

بظاہر اسے اردو املا کی خامی اور کوتاہی کہا جانے لگا کہ زیر، زبر، پیش اور ان کی خفیف ضمنی آوازوں کو ایک ہی علامات و اشکال سے ظاہر کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ اردو املا کی سہولت اور افادیت کی دلیل ہے۔ اگر ضمنی آوازوں کے لئے بھی علامات رکھی جاتیں تو اردو کا ابجد کا نظام الجھ کر رہ جاتا اور قاری کے لئے اس کا یاد رکھنا دوبھر ہو جاتا۔

ضمنی آوازوں کے لئے جُداگانہ علامتیں مقرر کرنے کی جگہ یہ بہتر سمجھا گیا کہ قاری کو بتا دیا جائے کہ مثلاً "ح" یا "ہ" (ساکن) سے پہلے کا فتحہ اردو میں خفیف ہے اور اس کا "ے" (لین) کی طرح تلفظ کیا جانا چاہیئے۔ مشہور ماہر صوتیات ڈاکٹر جونز کہتے ہیں کہ ضمنی آواز کے لئے کوئی خاص علامت رکھنا مشکل ہے۔ یہ زیادہ آسان ہے کہ قاری کو با قاعدہ بتا دیا جائے جس کی مدد سے وہ حسب ضرورت بنیادی اور ضمنی آواز میں فرق کرلیا کرے۔

فارسی یا عربی لفظ کی جب دوسرے لفظ کی طرف فارسی قاعدے کے مطابق (بطور اضافت یا صفت)، نسبت کی جاتی ہے تو اس کے آخر میں ایک کسرہ (زیر) آتا ہے، جیسے رنجِ بشر، روزِ قیامت حسنِ یوسف وغیرہ۔ یہ کسرہ خفیف ہے جو "ے" (مجہول) کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فارسی کے جو الفاظ "ا"، یا "و" پر ختم ہوتے ہیں اور ساکن الآخر ہونے کی وجہ سے ان پر کسرہ نہیں آسکتا، اضافت ظاہر کرنے کے لئے کسرے "ے" جیسے: آشنائے قدیم، گیسوئے سیاہ وغیرہ ان کلموں کے آخر کی "ے"، کسرۂ اضافت کی ہی قائم مقام ہے اور کسرے کی آواز کو ظاہر کرتی ہے اس لئے "ے" پر ہمزہ "ء" بے محل ہے۔

مرزا غالب فارسی لفظ کے آخر کی "ے" پر (جس سے پہلے "ا" یا "و" ہو) ہمزہ لکھنے سے منع کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ عقل کو گالی دینا ہے۔

عقل کو گالی دینا اس لئے کہ اردو املا صوتی اُصولوں پر مبنی ہے اس کا ہر قاعدہ زبان کے مزاج کو دیکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ فارسی الفاظ کے آخر کی "ے" کسرۂ اضافت کا حق ادا کر دیتی ہے اس لئے اسے ہمزہ سے بدل کر مکسور کرنا یا خود اس پر کسرہ دینا عقل کے خلاف ہوا۔ یہاں اس کی وضاحت ہو جائے

نوٹ انہیں کسرۂ مجہول، ضمۂ مجہول اور فتحۂ لین بھی کہہ سکتے ہیں۔

چاہیئے کہ فارسی کے جن کلمات کے آخر کی "ے" اصلی ہے لیکن عموماً "روپوش" رہتی ہے، جیسے: خدا (ے) جا (ے) پا (ے) بو (ے) رو (ے) جب یہ کلمے مضاف ہوں گے تو ان کی "ے" ظاہر ہو جائے گی، جیسے خدائے توانا - جائے پناہ - پائے سخت، بوئے گل، روئے نیاز وغیرہ -
غالب کہتے ہیں کہ ان کلمات کے آخر کی "ے" پر بھی ہمزہ اور زیر نہ لکھو - کیوں؟ اس لئے کہ ان کی "ے" پہلے "روپوش" تھی اضافت کے بعد ظاہر ہوئی - وہ اضافت ہی کی "ے" ہے اور کسرے کے قائم مقام ہے اس پر کسرہ دینے سے فائدہ؟ رہا ہمزہ سو اس کا یہاں کیا موقع ہے -

البتہ جب کلمۂ مضاف کے آخر میں ہائے مختفی ہو، جیسے: جامہ - روزہ وغیرہ تو اضافت کی صورت میں "ہ" پر ہمزہ دے کر اس طرح لکھیں گے جامۂ ابریشم، روزۂ رمضان ہمزہ اور "ہ" متحد المخرج ہیں کہ دونوں حلقوم میں پیدا ہوتے اور وترِ صوت سے ادا کئے جاتے ہیں - جب ان کلموں کی دوسرے کلموں کی طرف اضافت ہوئی اور ہائے مختفی میں کسرہ قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی تو "ہ" کو مجبوراً ہمزہ کا روپ اختیار کر کے زیر کا بار اٹھانا پڑا - اور یہ رد و بدل عارضی تھا اس لئے "ہ" کو برقرار رکھ کے اس پر ہمزہ بنایا گیا -

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ان کلمات میں ہائے مختفی کے اوپر جو ہمزہ لکھا گیا ہے وہ ہمزہ نہیں یائے تحتانی ہے - وہ کہتے ہیں کہ ہمزہ کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے - یہ بعینہٖ نصف بالائی حصہ "ی" کا ہے بلکہ کامل "ی" ہے یہ خیال بھی غالب کے لفظوں میں ایک طرح سے عقل کو گالی دینا ہے - "نامہ" اور "خامہ" وغیرہ ان کی ہائے مختفی کا ہمزہ صوتی اور لسانی کسی لحاظ سے بھی یائے تحتانی نہیں ہو سکتا - صوتی لحاظ سے اس لئے کہ "جامۂ نو" جیسی مثالوں میں صاف صاف ہمزہ کی آواز ادا ہوتی اور سنی جاتی ہے - لسانی اعتبار سے اس لئے کہ "ہ" ہمزہ کی ہم صوت ہے اور تاریخ میں برابر ہمزہ کا روپ اختیار کرتی رہتی ہے - اس لئے اسے ہمزہ ہی لکھنا چاہیئے -

اس سلسلے میں ایک اور بڑی گالی بھی عقل کو دی جا رہی ہے - خاصے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں شریک ہیں اس لئے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے - غالب نے الف واو پر ختم ہونے والے فارسی الفاظ کے بارے میں لکھا تھا کہ مضاف ہونے کی صورت میں ان کے آخر کی "ے" پر ہمزہ نہ لکھا جائے - ان بزرگوں نے عربی کے ان الفاظ کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جن کے آخر میں "ء" تھا لیکن اہلِ اردو کے تلفظ میں ہمزہ گر جانے کی وجہ سے آخر کا حرف الف بچ رہا تھا جیسے دعا (ء)، ارتقا (ء)، ابنا (ء)، شعرا (ء) وغیرہ - یہ حضرات کہتے ہیں کہ جب

عربی کے ان کلموں کی فارسی قاعدے کے مطابق اضافت کی جائے تو فارسی کلموں کی طرح ان کے آخر میں "ے" لکھی جائے ہمزہ نہ لکھا جائے۔ چنانچہ "ابنائے جنس" کو یہ صحیح بتاتے ہیں اور ابناءِ جنس کو غلط۔ ارتقائے حیات ان کے نزدیک ٹھیک ہے اور ارتقاءِ حیات غلط۔

میرے خیال میں یہ اصول کے خلاف ہے۔ عربی کے الفاظ جن کے آخر میں "ء" ہے جب تنہا بغیر اضافت استعمال ہوتے ہیں تو ان کا ہمزہ رُوپوش ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ان کی دوسرے کلمے کی طرف اضافت ہوتی ہے تو خُو، بُو، رُو وغیرہ فارسی الفاظ کے آخر کی "ے" کی طرح یہ ہمزہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اضافت فارسی قاعدے کے مطابق ہو یا عربی قاعدے کے، دونوں صورتوں میں ہمزہ بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہمزہ تلفظ میں آتا اور بولا جاتا ہے تو اسے لکھا کیوں نہ جائے۔ اور جب اس میں اضافت کا کسرہ قبول کرنے کی صلاحیت ہے تو اصول کے خلاف "ے" لکھ کر اسکی صورت مسخ کرنے سے فائدہ؟ خُو، بُو وغیرہ فارسی الفاظ کے آخر کی رُوپوش "ے" اضافت کے بعد الفاظ برانگندہ نقاب ہوسکتی تھی تو دنا، ارتقا، ابنا وغیرہ عربی الفاظ کے آخر کے ہمزہ نے کیا قصور کیا ہے کہ اضافت کے بعد وہ "انا الھمزہ" کا نعرہ بلند نہ کرے۔ اور مضاف ہونے کی صورت میں ابناءِ نہ لکھا جائے یہ املا کی صورت کے مطابق بھی ہے اور قواعد کے مطابق بھی .... صوتیات کے مطابق اس لئے کہ ابناءِ جنس وغیرہ ترکیبوں میں ہمزہ مکسور کی آواز ہم سنتے ہیں۔ قواعد کے مطابق اس لئے کہ "ابنا" وغیرہ کلمے اصلاً ہمزہ پر ختم ہوئے ہیں۔ جس طرح خُو، بُو وغیرہ کلمے "ے" پر ختم ہوئے تھے۔ اس لئے اگر خُو بُو وغیرہ کے آخر میں اضافت کے بعد "ے" لکھی جاتی ہے تو "ابنا" وغیرہ کلموں کے آخر میں ہمزہ لکھا جانا چاہیئے۔

کسرۂ اضافت کے سلسلے میں ایک اور بات بھی توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ جن فارسی کلمات کے آخر میں یائے مجہول ہے جیسے پے، مے، کے وغیرہ مضاف ہونے کی صورت میں قاعدے کے مطابق ان پر کسرۂ اضافت آنا چاہیئے لیکن "ے" چونکہ کسرۂ اضافت کی نیابت کر لیتی ہے اس لئے اس پر کسرہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یائے معروف اصلی پر کسرہ ضرور آنا چاہیئے جیسے :-

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اس لئے کہ "زندگی" کی "ی" میں کسرہ اضافت کی قائم مقامی کی صلاحیت نہیں ہے

اساتذہ۔ جاذبہ۔ داعیہ۔ وغیرہ الفاظ کی "ہ" فارسی جامہ، نامہ وغیرہ کلمات کی "ہ" کی طرح

ہے۔ اضافت میں ان کے ساتھ ہائے مختفی کا سا سلوک کیا جائے اور ان کی "ہ" پر ہمزہ لکھا جائے۔

اس کے بعد خالص اردو الفاظ کا سوال سامنے آتا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اردو الفاظ کے آخر میں "ا" ہوتا ہے ہ نہیں ہوتی۔ اس لئے ان الفاظ میں ہ نہ لکھی جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اردو الفاظ کے آخر میں بھی "ہ" ہوتی ہے اور یہ دو طرح کی ہے اصلی جیسے گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد میں اور وصلی جیسے ودیالیہ اوشدھالیہ وغیرہ میں لیکن سنسکرت تت سم الفاظ کو "ے" سے لکھتا ہوں جیسے ودیالے اوشدھالے یہ املا زیادہ صحیح ہے۔

"چھ" اور "پہ" میں بھی "ہ" ہے "پہ" کی دو شکلیں ہیں۔ ایک "پر" کی جگہ اور اسکے معنوں میں اس کا اہلِ دہلی کسرۂ خفیفہ سے تلفظ کرتے ہیں۔ دوسری مگر کی جگہ اور اسی کے معنوں میں۔ اس کا فتحہ سے تلفظ کیا جاتا ہے۔ غالب کا مصرعہ ہے "غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے"

"پہ" کو ہ سے لکھتے ہیں چھ کو بھی ہ سے لکھا جائے۔ اس کی ہ اصلی ہے۔ اہلِ دہلی اردو کے عام مزاج کے مطابق فتح خفیفہ سے جو اسکا تلفظ کرتے ہیں وہ اس "ہ" کی وجہ سے ہے (مشرقی یو۔پی میں چھ، پہ، کے وزن پر مفتوح ہے)

اردو اور فارسی آریائی خاندان کی زبانیں ہیں اور عربی سامی خاندان کی۔ فارسی اردو کا مزاج عربی زبان کے مزاج سے مختلف ہے ان پر عربی قاعدے نہ منڈھے جائیں۔ عربی کے ن وقایہ پر قیاس کرکے ہمارے بعض عالموں نے لکھا ہے کہ "ا" اور "و" پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر کی یائے وقایہ کسرے کے بچاؤ کے لئے لائی گئی ہے ان عالموں کی دیکھا دیکھی دوسرے خدائی، بڑائی، دعاؤں وغیرہ کلموں کے ہمزہ کو ہمزہ وقایہ کہنے لگے۔ یہ زبان کی تاریخ سے ناواقفیت ہے۔ آریائی زبانوں میں یائے وقایہ ہے اور نہ ہمزہ وقایہ۔ خدا اصل میں "خدائے" تھا۔ ہمزہ "ے" کا بدل ہے۔ "بڑائی" کی "ئی" ہمزہ اور ی کی ترکیب کا نتیجہ نہیں بلکہ "ائی" ایک آزاد اور مستقل لاحقہ ہے جس کا ذکر علمائے لسانیات نے کیا ہے۔ یہی حال "دعاؤں" کے ہمزہ کا ہے "وں" لاحقۂ جمع ہے۔ یہ مردوں اور عورتوں وغیرہ میں بھی ہے۔ اس طور پر مرد۔ "وں" = مردوں عورت - وں - عورتوں وغیرہ وغیرہ۔

جو کلمے کسی حرف صحیح ساکن پر ختم ہوتے ہیں لاحقہ وں اضافہ کرنے پر ان کا آخری حرف مضموم ہو جاتا ہے سو پر ختم ہونے والے کلموں پر پورا لاحقہ۔ وں بڑھایا گیا اس لئے کہ "ا" میں حرکت قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ "و" البتہ حرکت قبول کرتا ہے اس لئے "بچھو" اور "ہندو" وغیرہ

جائش با ہمزہ مکسور و نون غنہ بغیر یاد حق نیز مستعمل فصحا باشد (دریائے لطافت، ۱۷۹)

کلموں کی جمع بچھوؤں اور ہندوؤں (دو "و" کے ساتھ) ہوگی لیکن "و" پر ضمہ اور کسرہ اردو زبان کے مزاج کو سازگار نہ تھا۔ زبانوں پر ذرا، اولو سا محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے بچھو وغیرہ کلمات کا "و" ہمزہ سے بدل کر اردو بولنے والے "بچھووں" کو "بچھوؤں" "ہندووں" کو "ہندوؤں" کہتے ہیں۔ ہمزہ "و" کا بدل ہے اس لئے "و" کو گراتے نہیں باقی رکھتے اور اس پر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ ہوا (ہونا سے فعل ماضی صیغہ واحد مذکر) کی تانیث قاعدے کے مطابق "ہوی" اور جمع "ہوے" (و کے ساتھ) ہونی چاہیئے۔ لیکن فصحاء اردو کسرے کی وجہ سے "و" کو ہمزہ سے بدل کر "ہوئی" اور "ہوئے" کہتے ہیں۔

"چھوئی موئی" تانیث ہے "چھوا موا" کی۔ یہ ایک پودے کا نام ہے۔ قاعدے سے اسے بھی "چھوی موی" ہونا چاہیئے لیکن ہم سب ہمزہ لکھتے اور "و" کی جگہ ہمزہ کا تلفظ کرکے "چھوئی موئی" کہتے ہیں۔ ناسخ کے عہد تک آنا، جانا، پانا وغیرہ افعال کا مضارع آوے، جاوے، پاوے زبانوں پر تھا۔ اس کے بعد "و" پر کسرہ کے ثقل کا احساس ہوا تو فصحا نے "و" کو ہمزہ سے بدل کر آئے، جائے، پائے کہنا شروع کیا۔ لیکن آوے بھی چالو رہا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے ؛ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

آئے، جائے کی ایک مخفف شکل آے جاے (بغیر ہمزہ) بھی ہے۔ جیسے۔

آے ہے بےکسیٔ عشق پہ رونا غالب ؛ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ "آئے" کی جمع "آئیں" ہوگی اور "آے" کی جمع "آیں" (بغیر ہمزہ) انشا ہمزہ مکسور اور ن غنہ بغیر ے لکھتے ہیں۔ یہ درست نہیں اس لئے "آیں" جمع ہے "آے" کی جس میں "ے" ہے۔ بھی ہمزہ نہیں۔ جمع میں ہمزہ کہاں سے آیا اور کیسے؟

"ے" پر بھی کسرہ ناگوار سمجھا جاتا ہے لیکن اس صورت میں جب "ے" سے پہلے فتحہ ہو گیا کی جمع گئے ہوگی اس لئے کہ "ی" سے پہلے "گ" پر فتحہ ہے اور کیا، لیا، دیا، پیا، جیا، وغیرہ کلموں میں "ی" سے پہلے کسرہ ہے اس لئے ان کی جمع میں "ے" باقی رکھ کر لئے، دیے، کیے پیے، جیے کہیں گے۔ دیکھیے۔ لیجیے۔ بیٹھیے۔ اٹھیے۔ کہیے وغیرہ افعال جن میں "ے" سے پہلے کا حرف مکسور ہے "ے" سے لکھے جائیں گے۔ چاہیئے، آیئے، جایئے۔ گایئے، پایئے وغیرہ کلمات میں بھی "ے" سے پہلے زیر ہے انہیں بھی "ے" سے لکھا جائے اس باب میں انشا سے سہو ہوا ہے[1] تو اصول یہ ہے کہ ہمزہ اس وقت آئے گا جب اس سے پہلے زیر ہو۔ اگر ماقبل زیر ہے تو "ے" آئے گی یہ کلیہ قاعدہ ہے

---

[1] انشا نے (دریائے لطافت ص ۱۸۳) اٹھئے وغیرہ الفاظ کو اس طرح ضبط کیا ہے یا ہمزہ زیادہ حق یکے ہم بعد از مفرد ... (بشکریہ اردو نامہ کراچی)

حکیم محمد حسین خاں شفا

غالب اور رامپور

غالب ۲۷؍ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں شہرتِ عام اور بقائے دوام سے ہمکنار ہوئے اور دہلوی کہلائے۔ لکھنو، لاہور، بنارس، کلکتہ الغرض ہندوستان کے بہت سے شہروں کی سیاحت کی ..... لیکن کچھ خصوصی روابط اور چند ماہ کے قیام سے ان کو جو تعلقِ خاطر، اہلِ رامپور، شہر رامپور اور شہریارِ رامپور سے پیدا ہو گیا تھا، وہ ہندوستان کے کسی خطے کو حاصل نہیں ہوا۔ غالب نے اردو، فارسی نظم و نثر میں جو خراجِ عقیدت رام پور کو پیش کیا ہے وہ قابلِ غور ہے

وہ کہتے ہیں۔

رامپور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر ؞ کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

رامپور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے ؞ مرجع و مرجعِ اشراف و نژادِ عالم

رامپور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال ؞ دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں ؞ ہے اسی طور پہ یاں جلوہ فشاں دستِ کرم

ابر دستِ کرم کلب علیخاں سے مدام ؞ دُرِ شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبح دم باغ میں آ جائے جسے ہو نہ یقیں ؞ سبزہ و برگ و گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبذا باغِ ہمایونِ تقدس آثار ؞ کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلک شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس ؞ خضر بھی یاں اگر آ جائے تو لے ان کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہلِ سخن ؞ اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم

حق سے کیا مانگیے ان کے لئے جب ہو موجود ؞ ملک و گنجینہ و فیل و سپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل ؞ دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا غالبِ عاصی کے خداوند کو دے ؞ دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اولاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال ؞ ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

غالبؔ کی شناسائی کچھ صاحبزادگان رامپور سے ابتدائے شباب سے تھی جوان کے ہم مشرب بھی تھے اور ہم مزاج و شریک کار بھی۔ دہلی میں غالبؔ کی قیام گاہ کو کلب کی حیثیت حاصل تھی جہاں عرق خانہ ساز ولایتی پینے پلانے کے ساتھ ساتھ قلندرانہ لین دین بھی ہو جاتا تھا۔ جو دہلی کے بےفکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں کے گزرانے وقت کا شغلہ تھا۔ اس میں کئی مرتبہ حکامِ وقت کی مداخلت سے بےلطفی بھی پیدا ہو گئی۔ جب غالبؔ نے علمی شہرت حاصل کی اور گھر پر دوست احباب کے بچوں کو پڑھوانے لگے، اسی کے ساتھ ساتھ اصلاحِ سخن کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تو بہت سے رامپوری شعراء اور روساء کے بچے ان کے شاگرد ہو گئے جن میں نواب یوسف علی خاں ناظم بھی شامل تھے۔ غالبؔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

نواب یوسف علی خاں بہادر والئ رامپور میرے آشنائے قدیم ہیں۔ اس سال میرے شاگرد ہوئے ناظم ان کا تخلص دیا گیا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا ہے زندگی کا دار و مدار ان کے عطیے پر ہے۔۔۔۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ
انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

غالبؔ دو مرتبہ رامپور آئے۔ پہلی مرتبہ ۲ جنوری ۱۸۶۰ء کو نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر، دوسری مرتبہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی میں اور نواب یوسف علی خاں کی تعزیت کے سلسلے میں۔ غالبؔ جب رامپور تشریف لے آئے تو ان کے ایک دوست نے پتہ دریافت کیا جس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

یہ تو بتاؤ رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا چار دن والئ شہر نے اپنی کوٹھی (خورشید منزل) میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ نہ مانگا دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہو گئیں اب اسی میں رہتا ہوں۔ عجیب اتفاق ہے ڈاک گھر مسکین کے پاس ہے ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دہلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام محلے اور عرف کی حاجت نہیں۔۔۔۔

انہوں نے رامپور سے اپنے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں رامپور کے بارے میں تحریر کرتے ہیں

"یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔
پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔
بےشبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے اتنا شیریں کہاں ہوگا اتنا میٹھا کہ پینے والا گمان کرے

کہ یہ میٹھا شربت ہے سبک گوار، ہاضم سریع النفوذ، اس کو پی کر میں قبض وانقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں - صبح کو خوب بھوک لگتی ہے لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا.....

خدا کی قسم میں یہاں تندرست اور خوش ہوں دن کا کھانا ایسے اچھے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھتے تک میرے آدمی روٹی کھا چکتے ہیں - شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے - دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار، میں بھی خوش لڑکے بھی خوش -

اس لقوہ نور سراسر سرور میں غالب مغموم بہت مسرور ہے..... اور کیوں نہ ہو فقیر کی قدر و منزلت کیا اہالی شہر اور کیا والیٔ شہر ہر دو جانب سے ارزش سے بڑھ کر ہے -

یہاں کا ارمغان اہل شہر کی کشش سیرت و صورت اور روش خلوص و مسرت ہے یا نواب عالی جناب معلیٰ القاب کا دیدار پُر انوار اور گل افشانی گفتار ہے.....

شہر کا یہ حال کہ ذوق شعر گوئی و شعر فہمی کا جو پایا میں نے یہاں پایا جمیع اہل عنند کو بھی میسّر نہ آیا - رامپور کہاں اس باب میں شیراز و اصفہان ہے - ہر شخص شعر کا فریفتہ، شعر ہر شخص پر فریفتہ، شہریار کا حال یہ ہے کہ سچ عرض کرتا ہوں -

نواب صاحب کو پروردگار نے جیسا حسن تناسب اعضاء و اندام پایا ہے ویسا ہی حسن تخیل و اعجاز کلام دیا ہے - چند روز ہوئے بیاض حروف کے اوراق برائے اصلاح مرحمت فرمائے لیکن اس سحر حلال کو کوئی کیا ہاتھ لگائے..... دعا گو کہتا ہے کہ اسے نظر بد سے بچائے.....

اس خط میں ولی عہد ریاست کلب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:-

اور سنو تعجب کرو گے کہ فرزند دلبند بھی نواب صاحب کو اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ کا مالک ملا ہے - خوش گفتار صاحب کردار.....

۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور یہ فرزند دلبند نواب ہوئے - غالب مبارکباد دینے رامپور آئے - تحریر کرتے ہیں:-

"نواب صاحب حال بمقتضائے الولد لوالد بہ حسن اخلاق میں نواب فردوس آرام گاہ کے برابر بلکہ بعض شیوہ روش میں ان سے بہتر ہیں......

غالب کو بھی اس تقریب میں نواب صاحب نے ۱۲ سو روپے نذر کئے - اپنے ایک اور خط میں نواب

کلب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

سنو اب میں .....

رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں - قد رنگ شکل شمائل بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں - عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرا اور لہجہ متفاوت، حلیم ، خلیق ، باذل ، کریم ، متواضع ، متشرع ، شعر فہم سیکڑوں شعر یاد - نظم کی طرف توجہ نہیں ، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں - جلالائی ، طباطبائی کی طرز برتتے ہیں شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے - فصیح بیاں ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک نئی روح قالب میں آئے -

..... بعد اختتام مسائل طالب رخصت ہوں گا بعد حصول رخصت دلی جاؤں گا -

نواب کلب علی خاں کی جشن تاجپوشی میں غالب شریک تھے -

مرزا کے رامپوری لطائف

غالب کے رامپور آنے کے چند روز بعد نواب کلب علی خاں لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانے لگے تو روانگی کے وقت نواب صاحب نے غالب سے کہا :-

مرزا صاحب - خدا کے سپرد -

مرزا نے کہا ، حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں -

تفتہ کو لکھتے ہیں :-

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا ، بھیک مانگنے آیا ہوں - روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے .....

بھائی نواب مصطفیٰ خاں ..... آکر ملے ..... وہ رہگرائے داد سرور رامپور ہوئے اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی ہوں -

غالب کو ملنے والی رامپور سے امداد کی شکل یہ تھی - وہ لکھتے ہیں :-

ایک قرن ۱۳ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپے مہینہ ماہ بماہ کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہے "-

مجروح کو رامپور سے رقم طراز ہیں :-

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء ہے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینہ بنام دعوت اور دیا -

یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ بھائی دو سو سو میں کلام نہیں کلام اسمیں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ وشاگردانہ رہتے ہیں بہرحال غنیمت ہے رزق کے اچھی طرح

ملنے کا شکریہ چاہیے کی کا شکوہ کیا ...... رقم کے ساتھ ساتھ تحفہ تحائف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مختلف تقریبوں پر انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔

کبھی کبھی غالب بھی نواب صاحب کو تحائف بھیجا کرتے تھے۔

غالب کو رامپور سے ملنے والا وظیفہ نہ تو دوستانہ تھا اور نہ شاگردانہ، یہ کچھ سابقہ سیاسی خدمات کا صلہ تھا اور بخشش کا بہانہ تھا۔ استادی و شاگردی کا سلسلہ تو ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء سے نواب یوسف علی خاں کی زندگی میں ہی چند سال کے بعد ختم ہو گیا، جب کہ غالب دیگر شاگردوں کے کلام پر آخری لمحۂ حیات تک اصلاح دیتے رہے۔

وہ تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

رئیس رامپور سو روپے مہینہ دیتے تھے۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے کو حواس میں نہیں پاتا۔ توقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے عوضی "خدمات بہ لقائیں شمار کیجئے تو میں سکہ بھر سہی ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت۔ بے برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے ...... آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیتے جاتے ہیں۔

غالب کی تصنیفات رامپور کی وجہ سے بھی محفوظ رہیں اور رامپور کی امداد سے شائع بھی ہوئیں وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں، پہلے بھی نواب مغفور "یوسف علی خاں" نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے۔ تب پہلے سودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔" اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو روپے بھیجیں گے۔

اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانوں کی دریدہ گری اور فاقہ کشی کی نوبت آئی، وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا۔ اور اگر وہ غدر سے پہلے اپنا اردو دیوان رامپور نہ بھیج دیتے تو ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا ہوتا اور جس طرح ذوق، آزاد اور نیّر درخشاں کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا، دیوان غالب بھی اس آگ کی نذر ہو جاتا۔ ہنگامۂ غدر میں مرزا کا وہی کلام بچا جو رامپور میں محفوظ تھا۔ باقی ضائع ہو گیا۔

چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین، مرزا صاحب میرے سارے ہندی، فارسی نظم و نثر کے مسودات لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔

سو ان دونوں گھر والوں پر جھاڑو پھر گئی، نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔

غدر سے پہلے مرزا صاحب نے اردو کلام کا ایک نسخہ رامپور بھیجا وہ سلامت رہا اور ان کی نقل سے ۱۸۶۱ء میں موجودہ دیوان غالب تیار ہوا۔

شیخ اکرام صاحب کا یہ بھی خیال ہے "نواب یوسف علی خاں ناظم کا دیوان غالب کا عطیہ ہے اور اس کے ایک معقول حصے میں غالب کے خدوخال اس طرح نمایاں ہیں کہ اگر اس حصے کو دیوان غالب کے ضمیمے کے طور پر شائع کر دیا جائے تو بیجا نہ ہو"۔

ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے۔ نواب صاحب کی شاگردی دراصل غالب کو مالی امداد دینے کا بہانہ تھی کیونکہ اول یہ کہ نواب صاحب کو شاعرانہ باتوں اور شاعرانہ طرز بیان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، دوم یہ کہ ان کا دربار خود مشاہیر روزگار، محققین، شعراء اور علماء سے بھرا ہوا تھا، جن میں سے کسی سے یہ کام آسانی سے لیا جا سکتا تھا..... شفقت اور شریفانہ برتاؤ اور خیر سگالی کا یہ جذبہ نواب صاحب کی بے شمار فیاضیوں کی ایک مثال ہے۔

غالب نے جب رامپور سے دہلی کی طرف کوچ کیا تو راستے میں سخت علیل ہو گئے اور رامپور کا آخری سفر مریض غالب کے لیے زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ مختلف امراض نے گھیر لیا ہر سال خود قطعۂ تاریخ وفات کہنے لگے اور اپنی موت کی پیشین گوئی کرنے لگے یہاں تک کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ذی قعدہ ۱۲۸۵ء پیر کے دن، تہتر برس چار ماہ اس دنیا کی سیر کر کے خاندان لوہارو کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے اور آخری مراسم و فرض کی ادائیگی میں رامپور سے نواب کلب علی خاں کی بھیجی ہوئی رقم کام میں آئی۔

جس طرح زندگی میں ان کی بہت سی خواہشیں پوری نہیں ہوئیں، اسی طرح تجہیز و تکفین بھی ان کے عقیدے کے خلاف ہوئی مزار پختہ بنایا گیا جس پر میر مہدی مجروح کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے۔

یا حی یا قیوم

رشکِ عرفی و فخرِ طالبِ مرد ؛ اسد اللہ خاں غالب مرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں ؛ تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح ؛ ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

۱۲۸۵ھ

مالک رام

(کچھ نئے حالات)

ابھی پچھلے دنوں میں نے اپنی کتاب 'ذکرِ غالب' کا نیا ایڈیشن مرتب کیا ہے۔ اس پر نظرِ ثانی کے وقت وہ تمام مواد میرے پیشِ نظر تھا جو غالب کے پنشن کے مقدمے سے متعلق قومی دفتر خانۂ ہند (NATIONAL ARCHIVES OF INDIA) نئی دلّی میں موجود ہے۔ میں نے اس ایڈیشن میں اس قضیے سے متعلق پوری تفصیلات لکھ دی ہیں لیکن دلّی کے کاغذات میں مجھے غالب کی سب سے پہلی درخواست نہیں ملی تھی جو انھوں نے کلکتہ میں گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی۔ فہرست میں بھی کہیں کوئی نشاندہی نہیں کہ یہ کیا ہوئی۔ بہرحال چونکہ مرزا نے اپنی بعد کی متعدد درخواستوں میں اس کے مضامین کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ اس کی عدم موجودگی سے مقدمے کی کوئی تفصیل تشنہ نہیں رہ گئی۔

پار سال مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ انڈیا آفس لائبریری میں گیا تو یہاں میں نے غالب سے متعلق تمام کاغذات نکلوائے۔ انھیں میں یہ گمشدہ درخواست بھی مل گئی۔ اس سے مقدمے سے متعلق تو کوئی نئی بات نہیں ملی لیکن اس کی تمہید (اور کہیں کہیں درمیان میں بھی) انھوں نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے ان کی زندگی کے بارے میں بعض نئے حالات کا انکشاف ہوا اور بعض معلومہ حالات کی تصدیق یا توضیح ہوئی۔ انھی کا بیان یہاں مقصود ہے۔

اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ لوگ اپنی درخواستیں فارسی میں لکھتے تھے اور گورنر جنرل کے دفتر کا فارسی محکمہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کرکے کونسل کے روبرو پیش کر دیتا تھا۔ یقیناً غالب نے بھی اپنی درخواست فارسی ہی میں لکھی ہوگی اور دفترِ متعلقہ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اب میں اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ میں یہاں متن میں، اصل درخواست کے اقتباس پیش کروں گا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو حاشیے میں کوئی اور حوالہ یا تشریح کروں گا۔ یہ ضروری نہیں کہ معلومات سب نئی ہوں بلکہ مطبوعہ ذکرِ غالب کی بعض معلومات کا اعادہ بھی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ربط قائم رہے۔ وھوہذا

(۱) اس درخواست کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء ہے[1]

(۲) جب فوج کی کمان پیرون (MR. PERRON) کے ہاتھ میں تھی تو اس کی طرف سے میرے چچا نصراللہ بیگ خاں آگرے کے قلعہ دار مقرر ہوئے۔ پھر جب انگریز فوج نے اس علاقے میں پیش قدمی کی تو نصراللہ بیگ خاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور انگریزی حکومت سے

---

[1] مرزا دلّی سے ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے (ذکرِ غالب ص ۶۲) گویا انھوں نے حالات کا جائزہ لےکر تقریباً دو مہینے بعد اپنی درخواست پیش کر دی۔

مل گئے[1]۔ اس کے بعد جب انھوں نے لارڈ لیک سے ملاقات کی تو لارڈ موصوف نے بھی قلعہ کا نظم و نسق عارضی طور پر انہی سے متعلق رکھا۔ پھر جب مسٹر ویلیر (MR. VILLIERS) کمشنر اور قلعہ دار مقرر ہوئے، تو صوبہ کا صدر مقام بدل گیا۔ اس پر نصر اللہ بیگ خاں متھرا میں لارڈ لیک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں چار سو سواروں کے دستے کی کمان ان کے تفویض ہوئی اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی[2]

(۳) جب راجہ بھرت پور سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور لارڈ لیک کی (ولایت کو) واپسی کا فیصلہ ہوا، تو روانگی سے پہلے انھوں نے ان کی وفاداری اور خدمات کے اعتراف میں، نصر اللہ بیگ خاں کو صوبہ آگرہ میں سونک اور سونسا کے دو پرگنے حینِ حیات مقرری جاگیر میں عطا کئے[3]۔ ان کی جمع معافی پندرہ ہزار آٹھ سو (۱۵٫۸۰۰) روپے سالانہ مقرر ہوئی۔ ان دونوں پرگنوں کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھی[4]۔

اس چار سو سواروں کے دستے کی کمان اور سترہ سو کے مشاہرے اور جاگیر سے ان کی طاقت اور اثر و رسوخ میں بہت اضافہ ہو گیا۔

(۴) لارڈ لیک کی اصلی دستخطی سند (اور اس کی کرنیل براؤن کی مصدقہ نقل) اور لارڈ موصوف کا دستخطی پروانہ جو انھوں نے نصر اللہ بیگ خاں کو عطا کئے تھے میرے پاس موجود ہیں۔ اور ان کی نقول اس درخواست کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔

(۵) اس جاگیر کے دس گیارہ مہینے بعد نصر اللہ بیگ خاں جب کہ وہ باہر سیر کو گئے ہوئے تھے اچانک اپنے ہاتھی پر سے گر گئے۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور چوٹیں بھی آئیں۔ چند دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا[5]۔ اس پر جاگیر حکومت نے واپس لے لی اور اسواروں کے رسالے کو منتشر کر دیا

(۶) نصر اللہ بیگ خاں کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وفات کے وقت ان کے ورثا حسب ذیل تھے

(۱) میں (۲) میرا چھوٹا بھائی (۳) میری دادی یعنی نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ (۴) نصر اللہ بیگ خاں کی تین بہنیں۔ اس وقت میری عمر نو برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات کی۔ میری دادی ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔

(۷) اس حادثہ کے وقت خاندان میں یا تو عورتیں تھیں یا ہم دونوں کمسن بچے۔ اس لئے ہم میں سے کسی نے ان کے مال اسباب کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک شخص خواجہ حاجی نامی نے (جس کا ذکر آگے آتا ہے جو ان کا ملازم تھا۔ میدان خالی دیکھ کر مرحوم کے کیمپ کے تمام ساز و سامان، مال اسباب، خیموں، چھولداریوں، اونٹوں، پالکیوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ستر اسی اسوار اور ایک ہاتھی ساتھ لے جا کے نواب احمد بخش خاں سے مل گیا۔

(یہاں انگریزی عبارت میں نصر اللہ بیگ خاں کا داماد لکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ ترجمے کی غلطی ہے۔
نصر اللہ بیگ خاں ان کے داماد نہیں بلکہ بہنوئی تھے۔ اور ان کی بیوی ان سے پہلے لاولد فوت

---

[1] ذکر غالب، ص ۲۸

[2] میرزا نے حبیب اللہ ذکا کو لکھا تھا (اردوئے معلیٰ، ص ۲۶) کہ تنخواہ سترہ سو مقرر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ ماہانہ تھی (نیز دیکھئے ذکر غالب۔ ص ۲۹)

[3] اس جاگیر کے پروانے کی تاریخ ۲۱ ستمبر ۱۸۰۳ء تھی۔

[4] ذکر غالب، ص ۲۹۰۔ نیز اردوئے معلیٰ، ص ۲۶ (ذکا)،

[5] احوالِ غالب ص ۲۸، مکاتیب غالب ص ۰ وغیرہ

ہو چکی تھیں۔ یہ اس دستاویز میں بھی لکھا ہے۔)

(۸) چونکہ خواجہ حاجی، سواروں، ہاتھی اور ساز و سامان کے ساتھ ان سے آملے تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے انھیں اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر لیا جسے وہ بہر حال پہلے سے اپنے بہنوئی کے ملازم کی حیثیت سے جانتے تھے۔

(۹) کچھ دن بعد نواب احمد بخش خاں نے اعلان کیا کہ حکومت انگریزی نے نصراللہ بیگ خاں کے پسماندگان کے گزارے کے لئے پانچ ہزار سالانہ کا وظیفہ بتفصیل ذیل مقرر کیا ہے اور یہ رقم ان کی جاگیر (فیروز پور جھرکا) کے خزانے سے ادا کی جائے۔

خواجہ حاجی ۲٫۰۰۰ روپے

والدۂ نصراللہ بیگ خاں ۱٫۵۰۰ "

درخواست کنندہ (یعنی غالب) ۱٫۵۰۰ " شہ

(۱۰) جب میں بالغ ہوا اور مجھے بھلے بُرے اور نیکی بدی کی تمیز آئی تو میں نے محسوس کیا کہ نواب احمد بخش خاں نے وظیفے کی تقسیم میں دو غلطیاں کی ہیں۔

اول۔ انھوں نے مرحوم کے پسماندگان میں ایک اجنبی ملازم شہ شامل کر لیا ہے۔

دوم۔ انھوں نے میرے چھوٹے بھائی کو جو میری ہی طرح نصراللہ بیگ خاں مرحوم کا سگا بھتیجا تھا بالکل نظر انداز کر دیا ۹ہ۔ مزید مجھے بالخصوص اس بات پر غیر معمولی تعجب ہوا کہ لارڈ لیک کا سا دریا دل اور کریم النفس شخص، جس نے لوگوں کو لاکھوں کے عطئے دیئے اور وہ صرف پانچ ہزار روپے سال وظیفہ مقرر کرے ایک ایسے شخص کے ورثا کے لئے جس کی جاگیر کی آمدنی ایک لاکھ روپے سالانہ تھی۔

(۱۱) میں نے بارہا نواب احمد بخش خاں سے زبانی اور تحریری احتجاج کیا کہ خواجہ حاجی کو اس وظیفے میں کیوں حصہ دار بنا دیا گیا ہے۔ وہ کہتے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی، میں جرنیل صاحب (لارڈ لیک) کے سامنے اسے نصراللہ بیگ خاں کا رشتہ دار کہہ چکا ہوں۔ اگر اب میں کچھ اس کے خلاف کہوں تو یہ میری بے عزتی کا باعث ہوگا۔ چندے اور صبر کرو۔ خواجہ حاجی کی وفات کے بعد میں اس کے دو ہزار بھی تمہیں دونوں بھائیوں کو دیدوں گا۔ احمد بخش خاں میرے بزرگ اور میرے ہم قوم تھے اور ان کی مجھ سے دوہری دوہری عزیز داری تھی یعنی میرے چچا ان کے بہنوئی تھے اور میں خود ان کے بھائی الٰہی بخش خاں کا داماد تھا اس لئے میں خاموش رہا اور میں نے اپنے بھائی کو بھی منع کر دیا کہ نواب صاحب کے خلاف حکومت انگریزی سے کوئی شکایت نہ کی جائے۔

(۱۲) ایک زمانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اب کے سال پوری تنخواہ ہمیں ملے گی لیکن جب وظیفہ تقسیم ہوا تو دو ہزار کی مشارٌالیہ رقم خواجہ حاجی کے دونوں بیٹوں کو ادا کر دی گئی۔

(۱۳) میں مایوس ہو کر نواب حاجی احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور گیا اور ان سے کہا۔

شہ یہ ٹھیک نہیں۔ چونکہ وظائف کی تفصیلی تقسیم، ۴ جون ۱۸۰۶ء کے خط پر مبنی تھی اور اس درخواست کے وقت تک غالب کو اس کا علم بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ ناموں اور رقوم کا ٹھیک تعین نہ کر سکے۔

شہ اس سے خواجہ حاجی مراد ہے۔

۹ہ یہ ٹھیک نہیں کیونکہ پندرہ سو سالانہ انھوں نے دونوں بھائیوں کے لئے دیا تھا

"اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو ان کا حق دینا چاہیے یا پھر
مجھے اجازت دیجیے کہ میں جا کے اپنا مطالبہ حکومت کے سامنے پیش کروں"

اس زمانے میں نواب صاحب کو بہت زخم آئے تھے اور ان کے باعث وہ بہت بیمار رہے تھے۔ انہی ایام میں وہ بستر علالت سے اٹھے تھے پھر ان کی اوور کی مختاری بھی جاتی رہی تھی جس سے وہ بہت افسردہ اور غمگین تھے اور میرے سامنے رونے بلکہ ہچکیاں لینے لگے۔ فرمایا

"تم میرے بچے اور نور نظر ہو۔ دیکھتے ہو کہ مجھے کیسے زخم آئے ہیں اور کیسی مصیبت کا
سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا حق مارا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جرنیل اخترلونی[۱۰] کی اور میری دوستی
ختم ہو گئی۔ کچھ اور تحمل سے کام لو، تمہارا حق تمہیں پورا پورا ملے گا"

اس کے جلد بعد ہی اخترلونی کا انتقال ہو گیا اور پھر ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی خبر موصول ہوئی۔ نواب صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ سر چارلس مٹکاف کو آنے دو، میں تمہیں ان کی خدمت میں پیش کر کے تمہارا ان سے تعارف کرا دوں گا اور تمہارے معاملات اور تمہارے چچا کے سرکار انگریزی سے تعلقات ان کے گوش گزار کروں گا تاکہ حقدار کو اس کا حق مل سکے نہ صرف یہ بلکہ میں حکومت سے کہہ کر تم پانچوں[۱۱] کے نام الگ الگ سندلے دوں گا تاکہ میرے پیچھے باقاعدہ گزارہ ملتا رہے۔ سر چارلس مٹکاف کے آنے کے بعد بھرت پور کا معاملہ پیش آگیا[۱۲] اور وہ راجہ بھرت پور کو بچانے اور راج کے شورہ پشتوں کو سزا دینے میں مصروف ہو گئے۔ نواب احمد بخش خاں بھی وہاں جا رہے تھے انھوں نے مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا

میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی بیماری[۱۳] کی وجہ سے ایک مصیبت میں گرفتار تھا۔ مزید برآں قرضخواہوں نے تقاضوں اور شور و غوغا سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس لیے میں اس سفر کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا۔

---

۱۰ جرنیل اخترلونی ان دنوں دلّی میں انگریزی ریذیڈنٹ تھا۔ اس کا انتقال ۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء کو میرٹھ میں ہوا اور اس کی جگہ مٹکاف کا تقرر ۲۶ اگست ۱۸۲۵ء کو ہوا۔

۱۱ اس سے معلوم ہوا کہ اس درخواست (۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء) سے پہلے غالب کی دادی (یعنی نصر اللہ خاں کی والدہ) کا انتقال ہو چکا تھا۔

۱۲ بھرت پور کا قضیہ یہ ہے کہ ۱۸۲۳ء میں سر ڈیوڈ اخترلونی نے منظور کر لیا کہ بلدیو سنگھ کو یہاں کا راجہ بنا دیا جائے جو اس وقت نابالغ تھا بلدیو سنگھ کے چچیرے بھائی درجن سال نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر اخترلونی نے دلّی سے بلدیو سنگھ کی مدد کو سپاہ بھیج دی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز برما میں لڑ رہے تھے۔ لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل (۱۸۲۳ء-۱۸۲۸ء) اس لڑائی سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ انھوں نے اخترلونی کا حکم منسوخ کر دیا اور فوج کو واپس بلانے کے احکام صادر کر دیے۔ اخترلونی نے اس کا مطلب یہ لیا کہ حکومت کو مجھ پر اعتماد نہیں اور استعفیٰ دے دیا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ جب سر چارلس مٹکاف ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو انھوں نے کہا کہ اگر یوں معمولی معمولی راجاؤں کو حکومت کے خلاف من مانی کرنے کی اجازت دیدی گئی تو اس سے ملک میں انگریزوں کی ساکھ ختم ہو جائے گی۔ اب کمانڈر انچیف لارڈ کومبر میر (COMBER MERE) کی کمان میں بلدیو سنگھ کی کمک پر فوج روانہ کی گئی سخت مقابلے کے بعد ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو بھرت پور کا قلعہ فتح ہوا۔ درجن سال کو شکست ہوئی اور اسے ریاست سے نکال دیا گیا یوں بلدیو سنگھ کو دوبارہ بھرت پور کی گدی ملی۔

۱۳ گویا مرزا یوسف ۱۸۲۸ء سے پہلے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔

اس کے باوجود اس توقع پر کہ مجھے منکاف صاحب کی خدمت میں سلام کرنے کا موقع مل جائے گا، میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہیجان کی حالت میں چھوڑا، چار آدمیوں کو اس کی نگہداشت کے لئے مقرر کیا، کچھ قرض خواہوں کو طرح طرح کے وعدوں سے چپ کرایا۔ دوسروں کی نظر سے چوری چھپے، بھیس بدل کر کسی طرح کا ساز و سامان لئے بغیر، سو مشکلوں سے میں نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کے لئے روانہ ہو گیا۔

میرے بار بار کہنے کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے سر چارلس منکاف سے میرا تعارف نہ کرایا۔ اس اثنا میں نواب صاحب کے منہ پر لقوہ ہو گیا لیکن کچھ عرصے بعد ڈاکٹر ڈنکن (DUNCAN) کے علاج سے وہ ٹھیک ہو گئے اور فیروز پور واپس چلے آئے۔ حالانکہ سر چارلس منکاف بھی تین دن وہاں فیروز پور میں رہے اور میں بھی روزانہ احمد بخش خاں سے درخواست کرتا رہا۔ انھوں نے مجھے سر چارلس کی خدمت میں پیش نہیں کیا جب منکاف صاحب بہادر دلی واپس چلے گئے تو اب میں احمد بخش خاں سے بالکل مایوس ہو گیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ انصاف پسند حکمران اپنے متعلقین میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں احمد بخش خاں کا وسیلہ اور واسطہ تلاش کروں کیوں نہ کسی تیسرے آدمی کے بغیر میں آپ خود سر چارلس منکاف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تمام معاملات شروع سے لے کر آخر تک ان کے گوش گزار کر دوں لیکن قرض خواہوں کے شور و غل کے ڈر سے میرا دلی جانا ناممکن تھا۔ مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور آخر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے علاوہ انھی دنوں نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود کی خبر پھیلی۔ یقین تھا کہ سر چارلس منکاف بھی ان کی پذیرائی اور استقبال کے لئے جائیں گے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ کانپور جاؤں اور وہاں سے ان کی معیت میں واپس آؤں اور راستے میں کسی مناسب موقع پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مصیبت اور بے بسی اور قرض کا سارا افسوسناک احوال ان سے کہوں اور انصاف کا طالب ہوں۔

(۳) غرض میں اس ارادے سے فرخ آباد اور کانپور کی طرف روانہ ہو گیا۔ بدقسمتی سے جونہی کانپور پہنچا، میں یہاں بیمار پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ہلنے چلنے کی سکت بھی جاتی رہی۔ چونکہ اس شہر میں ڈھنگ کا کوئی معالج نہیں ملا، اس لئے مجبوراً ایک کرایہ کی پالکی میں لکھنؤ جانا پڑا [14] یہاں میں پانچ مہینے سے کچھ دن اوپر بستر پر پڑا رہا [15] یہیں میں نے نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود اور پادشاہ اودھ کے ان کے استقبال کو جانے کی خبر سنی۔ لیکن ان دنوں میں چارپائی سے اٹھنے تک کے قابل نہیں تھا۔ غرض کہ لکھنؤ کی آب و ہوا بالکل میرے راس نہیں آئی [16]

---

[14] سفر کی اس تفصیل سے حالی کا یہ بیان محل نظر ہو جاتا ہے کہ "چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں" اس لئے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ (یادگار غالب، ص ۲۵)

[15] غالب نے ابن حسن خاں کے نام کے خط میں بھی قیام لکھنؤ کی میعاد تقریباً پانچ مہینے لکھی ہے (اردوئے ادب، جولائی ۱۹۵۲ء) نیز ذکر غالب ص ۶۲

[16] یاد ہوگا کہ اس زمانے میں یہاں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت تھے اور غالب کے دوستوں نے ان سے غالب کی ملاقات کی کوشش کی تھی۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب کو غالب کے فارسی مکتوبات کا ایک مجموعہ ملا ہے۔ جس کی پہلی قسط انھوں نے تحقیق (حصہ دوم) میں شائع کی ہے۔ اس مجموعے سے متعلق ان کا ایک مضمون بھی ماہِ نو کراچی (فروری ۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انھوں نے آغا میر کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔ یہ وہی قصیدہ ہے جو اس وقت کلیات فارسی میں نصیر الدین حیدر بادشاہ کے وزیر روشن الدولہ سے مشترکہ منسوب ملتا ہے (قصیدہ ۴۹) اس کا مطلع ہے ؎

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم ہوس زلف تو تا سلسلہ جنباں رفتم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ناران

(۱۵) میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار علی بہادر (باندہ) کے باہمی بہت بڑانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب صاحب موصوف کے لئے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا اس لئے میں جوں توں کر کے گرتا پڑتا باندہ (بوندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً ۶ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

(۱۶) اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتہ مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروزپور سے نہ دلی جا سکتا تھا اب باندہ سے کیسے اور کیونکر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آخر دلی اور کلکتہ میں دونوں جگہ قانون تو وہی ایک ہے مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔

چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت نہیں تھی۔ اس لئے مجبوراً اکیلے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتہ جانا پڑا۔ دو تین ملازم میرے ساتھ تھے لیکن میں بہت کمزور اور تھکا ماندہ تھا نادرِ راہ[کلہ] اور کوئی آسائش کا سامان بھی نہیں تھا۔[ثلہ]

(۱۷) مرشد آباد پہنچا تو یہاں نواب احمد بخش خاں کے انتقال اور شمس الدین احمد خاں کی جانشینی کی خبر ملی۔ چونکہ میرا دعویٰ احمد بخش خاں کی جاگیر (فیروزپور) سے متعلق تھا اس لئے میں نے کہا، وہ زندہ ہوں یا مردہ، اس سے میرے معاملے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور کلکتہ پہنچ گیا۔[ولہ]

---

(۲) حالی نے لکھا ہے کہ آغا میر سے ملاقات اس لئے نہیں ہو سکی تھی کہ مرزا نے یہ شرط پیش کی کہ پہلی ملاقات کے وقت آغا میر میرے پہنچنے پر تعظیم دیں اور مجھے نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے (یادگار غالب ص ۲۵) چونکہ آغا میر کو یہ شرطیں منظور نہیں تھیں اس لئے مرزا نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اس سے متعلق مرزا لکھتے ہیں۔ "چوں در باب معانقہ وقت نخستین ملازمت از ان طرف تمہارنت۔ آن معاملہ ذہنی در خارج صورت وجود نگرفت (تحقیق (۱) ص ۳) اس سے معلوم ہوا کہ غالب نے کہا تھا کہ وہ نہ صرف تعظیم دیں بلکہ معانقہ بھی ہو۔ آغا میر نے یہ منظور نہ کیا چونکہ مرزا اس سے کم کو اپنی عزت نفس اور خودداری کے خلاف خیال کرتے تھے اس لئے یہ ملاقات نہ ہو سکی (کلیات نثر ص ۱۵ بنام بیچ مل)

کلہ نواب ذوالفقار علی بہادر کی وساطت سے انھوں نے باندہ کے ایک شخص امین چند سے دو ہزار قرض لیا تھا یہ روپیہ زادِ سفر مہیا کرنے کے کام میں آیا ہوگا (ماہ نو فروری ۱۹۶۲ء ص ۷) کلکتہ پہنچنے کے بعد محمد علی خاں (باندہ) نے بھی دو سو روپیہ بھیجا تھا (ایضاً) اور آگرہ سے بھی ڈھائی سو کی رقم پہنچی تھی (ایضاً ص ۸)

ثلہ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مرتبہ جو دلی سے نکلے تو پھر فیروزپور، کانپور، لکھنؤ اور باندہ میں کوئی سال بھر کے قیام کے بعد سیدھے کلکتہ چلے گئے۔ کلیات نثر غالب (ص ۶۳۔ ۶۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل حق خیرآبادی سے وداعی ملاقات نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے ان سے ملنے کو دلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے۔ کلیات کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے درخواست میں انھوں نے اختصار سے کام لیا اور اس کا ذکر مناسب خیال نہیں کیا۔

ولہ مقدمے پر تو کیا اثر پڑتا، لیکن لکھتے ہیں۔ اس سے دو خیال پیدا ہوئے۔ ایک یہ کہ جو خطرہ مستقبل میں پیش آتا وہ فوراً سامنے آ گیا یعنی اب آئندہ دستِ گدائی اپنے بھائیوں کے سامنے دراز کرنا پڑے گا (اس سے مراد احمد بخش خاں کی اولاد اور خصوصاً شمس الدین احمد خاں ہیں) دوسرے یہ کہ مقدمے میں کامیابی سے جو مسرت میرے تصور میں تھی، وہ غارت ہو گئی یعنی غاصب قوی سے انتقام لینا اور دوست احباب کی مجلسوں میں اس کا فخریہ اظہار کرنا (تحقیق (۱) ص ۱۲)

یہاں تک تو گزشتہ بیس برس کے واقعات تھے۔ اب میں نصراللہ بیگ خاں کے خاندان کی اور اپنی ذاتی شکایات، اور خاص اپنی درخواست واضح کرنا چاہتا ہوں۔

(۱۸) حضور والا!

(الف) نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین میں ایک شخص خواجہ حاجی نام تھا جو ۱۸۰۶ سے ۱۸۱۹ برس تک احمد بخش خاں کے ذریعے دو ہزار سالانہ لیتا رہا۔ کوئی تین برس ہوئے، اس کا جذام کے مرض سے انتقال ہو گیا اور اس کے بعد احمد بخش خاں کی جاگیر سے اس کے دو ہزار اس کے بیٹوں کو ملنے لگے۔

خواجہ حاجی کا قصہ یہ ہے:۔

نصراللہ بیگ خاں کے والد کے زمانے میں، جن کا نام قوقان بیگ خاں تھا ایک نوجوان خواجہ مرزا نام ان کے ہاں اسواروں کے دستے میں بارگیر (سائیس)، کے طور پر کام کرتا تھا اس کی تنخواہ پانچ روپے ماہانہ تھی[20] قوقان بیگ کی بیوی (یعنی نصراللہ بیگ خاں)، کی والدہ کی ایک بیوہ ہمشیر تھی جس کے ایک نا کتخدا لڑکی تھی۔ نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اپنے دوسرے متعلقین اور لواحقین کی طرح اپنی اس بہن اور بھانجی کی بھی پرورش اور نگہداشت کرتی تھیں۔

قوقان بیگ خاں نے اپنی بیوی کی اس یتیم بھانجی کا نکاح خواجہ مرزا سے کر دیا۔ یہ خواجہ حاجی انہی دونوں کی اولاد تھا[21]۔ دوسرے لفظوں میں خواجہ حاجی کی والدہ، نصراللہ بیگ خاں کی والدہ کی بہن کی بیٹی ہوتی تھیں۔

اس کے علاوہ دونوں کے درمیان یا ان کے والدین ہی کے درمیان، نہ پہلے نہ اب ہی[22] کوئی اور رشتہ یا تعلق تھا۔

(ب) نصراللہ بیگ خاں کے جائز وارثوں میں سب سے پہلے میری دادی (یعنی نصراللہ بیگ خاں کی والدہ) جنہیں نواب احمد بخش خاں اپنی زندگی میں پندرہ سو روپے سالانہ دیتے رہے۔ اور ان کی وفات[23] کے بعد یہی رقم ان کی سب سے بڑی بیٹی (یعنی نصراللہ بیگ خاں کی سب سے بڑی بہن) کو ملنے لگی۔ یہ انھیں اب بھی ملتی ہے اسی سے وہ اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے گزارے کا انتظام کرتی ہیں لیکن چونکہ ان کے مرحوم بھائی اور والدہ کے پرانے ذاتی ملازم اور متعلقین بھی انھیں کے ساتھ رہتے ہیں، اس لئے یہ رقم کسی طرح ان کے خرچے کو کفایت نہیں کرتی۔ انھوں نے گھر کا تمام ساز و سامان بیچ کھایا ہے اور اب ہزاروں کے مقروض ہیں[24]۔

---

[20] یہی بات انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کو بھی لکھی ہے (متفرقات غالب ص ۶) وہاں البتہ اس شخص کا نام نہیں لکھا اور تنخواہ کا تعین بھی نہیں کیا۔

[21] اس سے معلوم ہو گا کہ قمر الدین راقم نے (احوال غالب ص ۳۰) اور ان کے تتبع میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے (مضامین فرحت، حصہ چہارم) میں جو لکھا ہے کہ مرزا کے پردادا اور خواجہ ان کے پردادا آپس میں بھائی بھائی تھے تو اس میں کتنی صداقت ہے۔

[22] جہاں تک اب کا تعلق ہے یہاں ایک دور کا رشتہ ثابت کیا جا سکتا ہے یعنی غالب کی بڑی ہمشیر چھوٹی خانم کے شوہر مرزا اکبر بیگ تھے۔ اور مرزا اکبر بیگ کی ایک بہن خواجہ حاجی کو بیاہی تھیں رشتہ آپ خود متعین کر لیجئے ضمناً یہ بھی لکھ دوں کہ مرزا اکبر بیگ کے ایک بھائی مرزا افضل بیگ تھے، یہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا تھے۔

[23] جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں (حاشیہ ۱۳) اس سے بھی ثابت ہے کہ اپریل ۱۸۲۸ء سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

[24] میرے خیال میں یہ وہی پھوپھی ہے جس کے انتقال کی خبر انھوں نے ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو دی تھی (نادرات غالب ص ۴۹-۵۰ حصہ مکتوبات)، ان کا انتقال اس سے دو دن پہلے ۲۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کو ہوا تھا۔

(۱۷) میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں یوسف اللہ خاں میرا بھائی ہے جو مرحوم کا بھتیجا ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے اسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی وہ کئی مرتبہ احمد بخش خاں کے پاس گیا اور اپنا دکھڑا رویا، لیکن نواب صاحب ہمیشہ طرح طرح کے وعدوں سے اس کا منہ بند کر دیتے اور وہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا جاتا۔ آج تک اس کا گزارہ گھر بار کا سامان بیچنے اور میری مدد پر رہا ہے۔

وہ جوان تھا اس کی شادی ہو چکی تھی، خرچ بڑھ رہا تھا اور آمدنی مفقود، انھیں تفکرات نے اس کے دماغ کا توازن بگاڑ دیا اس پر ہذیانی اور جنون کی کیفیت طاری ہو گئی اور اب وہ مستقل بیمار ہے۔

میں چھ سو روپے سالانہ اس کے علاج پر خرچ کرتا ہوں۔ اس کے بیوی ہے، ایک لڑکی ہے جو اس کی صحت کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی، نوکر چاکر اور خادمہ، ملازم اس کے علاوہ ہیں چار آدمی تو صرف اس کی نگرانی اور دیکھ بھال ہی کے لئے چاہئیں۔ آج تک اس کی بیوی گھر کی چیز بست بیچ بیچ کر گذارا کرتی رہی ہے، لیکن تابکے

(۱۸) نصر اللہ بیگ خاں کا اور وارث آپ کا یہ درخواست گزار ہے۔ میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے اور عرف میرزا نوشہ۔ احمد بخش خاں مجھے پندرہ سو سال دیتے تھے۔ میں نے آج تک اپنے والد مرحوم کے ترکے کو بیچ بیچ کر زندگی بسر کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے نانا خواجہ غلام حسین خاں نے بھی کچھ جائیداد چھوڑی تھی۔ وہ آگرہ کے چوٹی کے عمائد میں سے اور نواب نجف خاں کے دربار کے مشہور امراء میں سے تھے۔ آخر میں نے ضرورت سے مجبور ہو کر آگرہ چھوڑا اور دلی کی سکونت اختیار کی، جو میرے بزرگوں کا اصلی وطن تھا۔ یہاں میں نے بسر اوقات کے لئے والد اور نانا کی متروکہ جائیداد بیچ ڈالی اور اس کے باوجود آج مجھ پر بیس ہزار کا قرض ہے۔

(۱۹) اب میں دو مہینے سے اس دادرس گاہ (کلکتہ) میں آیا ہوں، میری خواہش یہ ہے کہ حکومت میری شکایتوں کا ازالہ کرے تاکہ میں خوش و خرم واپس جاؤں اور اطمینان و آرام سے وہاں رہ کر اپنے بھائی کا علاج کرا سکوں۔ اور اگر حکومت نے میری شنوائی نہ کی تو میں کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاؤں گا۔ مثلاً عرب ہے، عجم ہے۔ اور زندگی کے باقی ایام کہیں بھیک مانگ کر گزار دوں گا کیونکہ میرے جو تعلقات حکومت سے ہیں، ان کے پیش نظر یہ تو ناممکن ہے کہ میں ہندوستان میں کسی کے دروازے پر جا کر خیرات مانگوں۔

(۲۰) الغرض میری درخواست یہ ہے :-

حکومت نے جب نواب احمد بخش خاں کو جاگیر دی ہے، تو شرط یہ تھی کہ وہ اس کی ۲۰ - ۳۰ ہزار[شہ] جمع سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔ پھر جب نصر اللہ بیگ خاں فوت ہوئے تو فیصلہ ہوا کہ وہ ان کے اسواروں کی دیکھ بھال کریں گے اور نیز مرحوم کے پس ماندگان کو گزارہ دیں گے اور ان دونوں خدمات کے عوض میں یہ جمع معاف کر دی گئی تھی۔ حکومت تحقیق کرے اور نواب شمس الدین احمد خاں سے گزشتہ بیس بائیس برس کا حساب طلب کرے تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے کتنے اسوار رکھے؟ ان پر کیا خرچ ہوا؟ اور نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان کے گزارے کے لئے کتنی رقم ادا ہوئی؟ نواب احمد بخش خاں نے نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان کے لئے خود بخود ہی پانچ ہزار سالانہ کی رقم مقرر کر دی اور اس میں سے بھی ہمیں صرف تین ہزار ملے، کیونکہ خواجہ حاجی کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا گویا وہ تمام رقم جو نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں سے نصر اللہ بیگ خاں کے پسماندگان کے لئے مقرر ہوئی تھی اور ہمیں ادا کی جانا چاہئے تھی، اس میں سے ہمیں صرف تین ہزار سالانہ ملے، اور وہ

شہ ٹھیک رقم پچیس ہزار روپے سالانہ تھی۔

بھی دو آدمیوں کو یعنی نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ (اور اب ان کی ایک ہمشیر) اور ایک بھتیجے کو، دوسرے رشتہ دار نظر انداز کر دیئے گئے پس نہ یہ رقم ہی کافی تھی، نہ اس کی تقسیم کا طریقہ ہی درست تھا[۲۷]

میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے خاندان کا ایک ملازم میرے ساتھ برابر کا حصہ دار ہو[۲۸] اور نہ ہی میں اس وظیفے کے لئے کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو آمادہ ہوں[۲۹]

حکومت ہی میری سند ہے، میری ضمانت ہے، میرا ثبوت، میری قوت اور میری آماجگاہ ہے۔ حکومت مہربانی کر کے اس معاملے کی پوری تحقیقات کرے۔ لارڈ لیک کی ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۶ء کی خط وکتابت اور سندات ملاحظہ فرمائی جائیں۔ یہ کلکتہ کے دفتر میں موجود ہوں گی ان سے یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ نواب احمد بخش خاں کو جو یہ تین لاکھ مالیت کی جاگیر دی گئی تھی، تو اس کے ساتھ کیا شرط وابستہ تھی۔ جس کی بنا پہلے یہ ہزاروں کی جمع معاف ہوئی۔ شرط یہی تھی کہ وہ لے نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان کو ادا کریں۔ حکومت دیکھے گی کہ ہمیں تین ہزار سالانہ سے ایک حبہ زیادہ نہیں ملا۔

دو ہزار سالانہ جو خواجہ حاجی کو ملتے رہے، تو اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور وہ اس رقم سے کسی صورت میں بھی وضع نہیں ہونا چاہئیں جو ہمارے خاندان کے لئے مقرر ہوئی تھی۔

حکومت دیکھے گی کہ جو رقم اس نے پچاس اسواروں کی دیکھ بھال اور تنخواہ وغیرہ کے لئے معاف کی تھی ان کی جگہ کوئی اسوار رکھا ہی نہیں گیا۔ پس جب وہ شرط ہی پوری نہیں کی گئی، تو معافی کس بات کی؟ لیکن اس روپے پر میرا یا میرے خاندان کا کوئی حق نہیں، یہ رقم حکومت کے خزانے میں جانا چاہیئے۔

نصر اللہ بیگ خاں کے پسماندگان اور وارثوں کی تحقیق کی جائے، معلوم ہو گا کہ اس وقت کے جائز وارث صرف اس کی تین بہنیں اور دو بھتیجے ہیں۔ جو تین ہزار سالانہ ہمیں ملتا رہا ہے اسے منہا کر کے باقی رقم ان افراد کے درجے اور ضروریات اور استحقاق کو مد نظر رکھتے ہوئے ان میں تقسیم کر دی جائے[۳۰] اسی اساس پر حکومت ان پانچوں افراد کا حصہ بھی متعین کر دے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی الگ سند عطا کر دی جائے جس کے مطابق آئندہ وہ اپنا اپنا وظیفہ حکومت کے خزانہ دہلی سے وصول کرتے رہیں[۳۱] انتہی

(۲)

غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سبد چین کا جدید ایڈیشن مرتب کروایا تھا۔ اس میں انھوں نے کچھ اشعار کا اضافہ کیا

---

[۲۷] تا [۳۱] گویا مختصراً درخواست یہ تھی:۔

(۱) موجودہ تین ہزار (یا پانچ ہزار) کا وظیفہ ناکافی ہے اور اس کی تقسیم ٹھیک طریقے پر نہیں ہوئی۔

(۲) خواجہ حاجی (یا اس کی اولاد) کو ہمارے وظیفے میں سے کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔

(۳) تین ہزار سالانہ وضع کر کے گزشتہ اتنے برس کا بقایا دلایا جائے (۴) وظیفے حسب حیثیت پھر سے متعین کئے جائیں۔

(۵) تمام وظیفہ خواروں کو الگ الگ سند دی جائے اور (۶) یہ وظیفے آئندہ فیروزپور کی جاگیر کی بجائے انگریزی خزانۂ دلی سے ادا ہوں۔

یہی باتیں اس قصیدے میں بھی کہی ہیں جو انھوں نے ۱۸۳۰ء میں سر چارلس مٹکاف کی مدح میں لکھا تھا (قصیدہ ۳۵)، ہاں اس قصیدے میں انھوں نے اپنے لئے مزید اعزاز واکرام اور خطاب و خلعت کا اضافہ کر دیا ہے۔

(باقی صفحہ ۱۱۰ پر)

عرش ملسیانی

غالبؔ بحیثیت غزل گو

غالب کا نام آتے ہی اس کا یہ آفاقی شعر ذہن میں آجاتا ہے : ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

تجمل حسین خاں کی مدح میں جو غزل نما نظم انہوں نے کہی اُس میں انہوں نے مدح کے پردے میں اپنی بلند پروازی کے جو جوہر دکھائے ؏

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

یہ مصرع مستقبل میں سائنس کی ترقی اور دُور بینی پر دال ہے۔ مدح سے پہلے اصل غزل میں خدا جانے وہ کس موڈ میں تھے کہ غزل کی تنگ دامنی کے گلے پر اُتر آئے : ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

لیکن ہم غور سے دیکھتے ہیں تو غالب کے تمام سرمایۂ سخن میں غزل ہی غالب ہے۔ حالانکہ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پہ مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اُٹھاتا :

مرزا کبھی دل کی بات بے باکی سے کہہ جاتے تھے اور کبھی فن کی بات برائے تفنن بھی کرتے تھے۔ لیکن انہیں اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر بڑا ناز تھا ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن اللہ کو شاید یہی منظور تھا کہ ان کا اردو دیوان اتنا مقبول ہوا کہ ان کے فارسی کلام کو لوگ قریب قریب بھول گئے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے جوہر کو پرکھنے والے ان کے بعد آئیں گے۔ خود ان کی زندگی میں ان کی پوری قدر نہیں ہوئی تو مضائقہ نہیں ؎

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مستقبل کے باب میں حکم بھی لگاتے ہیں: ؎

ہے چہ می گویم اگر ایں ست وضعِ روزگار
دفترِ اشعار بابِ سوختن خواہد شدن

یہ اپنے عہد پر طنز ہے۔ لیکن اس عہد کے شعراء کی تعریف میں رطب اللسان بھی ہیں ؎

مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شان

غالب کی اردو غزل پر ذرا تفصیل سے کچھ لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی فارسی غزل پر بھی طائرانہ نظر ڈالی جائے کیونکہ غالب کا غزل گو کی حیثیت سے جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی فارسی غزل کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

مرزا اوّل اوّل فارسی میں بیدل کا تتبع کرتے تھے، لیکن بعد میں اس روش سے کنارہ کش ہو گئے۔ بیدل کی دقت پسندی مقبولِ عام نہ تھی اور خود انہوں نے جب اپنے پیش رو عرفی، نظیری، طالب آملی وغیرہ کو دیکھا تو ان کی روش انہیں پسند آئی۔ وہ کسی صورت سے ان کے مقلد تو نہیں تھے لیکن ان کے ذہن نے ان سے استفادہ ضرور کیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رو تھے دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ رو بھٹکتا پھرتا ہوں ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ

نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا، اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہِ والا شکوہ کے فیضِ تربیت سے میرا کلکِ رقاص جو چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقاء"

مرزا اپنے قلم کو پرواز میں عنقا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ کوئی تعلی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ ہے۔ وہ سب کے "ہمراہ" چلتے ہیں لیکن تصوف کا عنصر ان کے کلام میں غالب ہونے کی وجہ سے وہ نظیری کے زیادہ قریب ہیں۔ ذرا نظیری اور غالب کے ایک ہی زمین میں شعر ملاحظہ فرمایئے:

نظیری: کس از معانقۂ روز وصل یا بد ذوق
کہ چند شب زہم آغوش خود جدا خفتست
شمیم مہر ز باغ وفا نمی آید
بہر چمن کہ تو بشگفتہ صبا خفتست

غالب: درازیٔ شب و بیداریٔ من این ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفتست
بہ بیں زدودِ مجو قرب شہ کہ منظر را
دریچہ باز و بہ دروازہ اژدہا خفتست

اب آپ دیکھیں کہ غالب نظیری کی ہم چشمی کس شان سے کرتے ہیں۔ حالانکہ مرزا جلال اسیر نے فرمایا تھا۔ ؎

ہم چشمی نظیری ہو لبشر نہ باشد

اور صائب کا قول تھا ؎

صائب چہ مجال است سخری ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اب ذرا ظہوری کے مقابلے میں غالب کا کلام دیکھیے: ؎

ظہوری: بعشق قابل دیوانگی خرد مند است
ہمہ ز جہد کہ آزاد مرد این بند است
مگر کہ رخصت دیوانگی شود مرہم
کہ گوش دل شدگاں ریش گشتہ پند است
بہ غم کہ عہد گسل وردرتِ کشائش ناز
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوند است

بگو حدیثِ وفا از تو باور است بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند است

غالب: چو صبحِ من ز سیاہی بہ شام مانند است
چہ گوییم کہ ز شب چند رفت یا چند است
نگفتہ کہ بہ تلخی لب از و پند پذیر
برو کہ بادۂ ما تلخ تر از پند است
دراز دستیٔ من چاکی رفگند چہ عجب
ز پیشِ دلق ورع با ہزار پیوند است
ز بیم آں کہ مبادا بمیرم از شادی
نہ گرید ار چہ بمرگِ من آرزومند است

یہ غزلیں سعدی کی مشہور زمین میں ہیں۔ اس میں عبدالرحیم خان خاناں کی غزل بہت مشہور ہے ؎

نہ دام دانم و نے دانہ ایں قدر دانم
کہ سر ز تا بقدم ہر چہ ہست دربند است
مرا فروخت محبت ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است

اور اس زمین میں حال کے شاعر گرامی کا لافانی شعر ہے ؎

بسے بگشتم و جز لیک عشق کم دیدم
دلاتے کہ در آں بندہ بے خداوند است

لیکن غالب کو دیکھئے کس صفائی اور سادگی سے اس نے پرکاری کی ہے۔
ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی محفل میں حافظ کا مشہور شعر گایا جا رہا تھا ؎

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

تو کسی نے کہا: کاش دوسرا مصرع بھی پہلے مصرعے کی طرح ہوتا اور یہ کہنا ہی پڑتا کہ "کجا دانند ......"
اس پر کئی شعر سنائے گئے ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی
طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را (نظیری)
بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر (نظیری)

از لالۂ ما خبر ندارد
آسودہ کہ بر کنار دریاست (سعدی)

وہیں کسی نے مرزا غالب کا شعر سنایا اور محفل پھڑک گئی ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

اب ذرا مرزا کے مختلف فارسی اشعار کا لطف اُٹھائیے۔
وہ اپنے عہد کے نابکار لوگوں سے اس قدر بیزار تھے کہ فرماتے ہیں ؎

مرا ز روز قیامت غمے کہ ہست این است
کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید

آم کے شوقین تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

عرفی کی مشہور زمین "غوغائے من" میں کس بلا کا مطلع کہا ہے ؎

زاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من

صعوبتوں میں بسر ہونے والی زندگی جب چیخ اٹھتی ہے تو اس قسم کا مطلع نازل ہوتا ہے۔
عرفی نے کہا تھا ؎

ہم سمندر باش و ہم کشتی کہ در جیحونِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

سانے کا مضمون تھا۔ لیکن غالب کی طبع دقت پسند وہ مضمون نکال کر لائی کہ ایک نفسیاتی حقیقت کو بھی واضح کر گئی اور نفسیات کے ایک دقیق نکتے کو حل کر گئی ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتشی است

مرزا کی طرز ادا اور ندرتِ خیال میں بڑی انفرادیت ہے۔ انہوں نے عرفی و ظہوری کو جگہ جگہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ ان کی نیک نیتی ہے ؎

غالب از جوش دم ما تربتش گل پوش باد
پردۂ سازِ ظہوری را گل افشاں کردہ ایم
کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب

جامِ دگراں بادۂ شیراز نہ دارد

ذیل میں غالب کے چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں: ؎

جانِ غالب تابِ گفتاری گماں داری ہنوز
سخت بے دردی کہ می پرسی زما احوالِ ما

زمن بہ ذوقِ طپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاکِ من و آرمیدنم بنگر

از ہر بُنِ مُو چشمۂ خوں باز کشادم
آرائشِ بستر ز شفق می کنم امشب

بامن بخوابِ نازو من از رشک بدگماں
تا عرصۂ خیالِ عدو جلوہ گاہ کیست

مے بہ زہاد دگر عرض کہ ایں جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم بہ شوربائے زمزم نرسد

غالب کے باب میں بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ ایرانی نہ تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی۔ انہیں شیراز، اصفہان یا طہران جانے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن ان کا قول تھا کہ مبداء فیاض نے انہیں فارسی کا ذوق ازل سے بخشا تھا وہ اس زبان کی ہر قسم کی لطافت و حلاوت سے واقف تھے۔ وہ کسی حیثیت سے نظیری، عرفی، ظہوری اور دوسرے ہندوستانی شعراء سے کم نہ تھے۔ اپنے زمانے میں خود کو تنہا پاتے تھے اور کہتے تھے ؎

بیا ورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

غالب کے ایک معزز ہم عصر اور ممدوح مفتی صدرالدین آزردہ غالب کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے۔ اور اس کو پرانے فارسی شعرائے کم درجہ سمجھتے تھے۔ انہیں مخاطب کر کے مرزا نے ایک مقطع کہا ہے۔ یہ مقطع صرف آزردہ پر ہی چوٹ نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ غالب ماضی سے زیادہ حال کے معتقد تھے، اور یہ ان کے ترقی پسند ذہن کا تقاضا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

نوائے کہ ہمہ سخن گستران پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

یہ تو رہا اُن کی فارسی غزل گوئی کا تذکرہ، — اب اُن کی اردو غزل گوئی کی طرف آئیے جس کی وجہ سے آج ہندوستان میں اُن کی عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس چھوٹے سے اردو دیوان کے اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہیں —

کتنے ہی ضرب الامثال بن گئے ہیں۔ ان شعروں میں زندگی ہے۔ نفسیات ہے، تازگی، شگفتگی اور شوخی ہے۔ انہوں نے زندگی کے اسرار و رموز حل کئے ہیں۔ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے کرتے وہ آفاقیت پر اتر آئے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

انہوں نے اپنی زندگی میں زمانے کی بڑی نیرنگیاں دیکھیں ننھیال اور سسرال کا تموّل دیکھا۔ چچا کی جاگیر کے حصہ دار بنے۔ پنشن تو ساڑھے باسٹھ روپئے اور ۔ وہ اسے رزقی بتے تھے۔ پنشن کے لئے عمر بھر لڑتے رہے' لاکھوں کا بقایا مانگتے تھے۔ اس زمانے میں کھٹکتے تھے'۔ پنشن تو کیا ملتی الٹا قتل کے حواریوں اور حامیوں سے جھگڑا مول لے لیا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اپنی آنکھ سے دیکھا۔ دلی کی بادشاہی اور دربار کا اُجڑنا، صاحبانِ علم، امراء اور شریفوں کا پائمال ہونا اور بعض کا گولی سے مارا جانا انہوں نے آنکھوں سے دیکھا۔ افراتفری کے عالم میں نہ کوئی یار نہ غم گسار۔ گھٹیا رستم کے لوگوں سے سابقہ، ایسے میں وہ یہ نہ کہتے تو کیا کہتے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اس زمانے میں اگر شیفتہ، شیونارائن آرام، ہرگوپال تفتہ، نواب یوسف علی خاں، والی رامپور، اور حالی، اور مجروح نہ ہوتے تو غالب چیخ پڑتے اور نہ جانے ان کے حواس بھی قائم رہتے یا نہیں۔

اردو میں غالب اپنے پیش رووں میں میر کے قائل تھے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

فارسی میں دیکھئے، اردو پر نظر ڈالئے۔ غالب کو اپنے مرتبے کا احساس واقعی ہے۔ لوگوں نے اسے خودستائی اور خودپسندی پر بھی محمول کیا ہے۔ لیکن شاید ان کا یہ خیال صحیح نہ ہو۔

انہوں نے اول اول طرزِ بیدل اختیار کی۔ لیکن بعد میں احباب بالخصوص فضل حق خیرآبادی کے مشورے سے وہ آسان زبان میں عام فہم اشعار کہنے لگے۔ شاعروں کی ان کی دقت پسندی کے پیشِ نظر ان پر چوٹیں ہوتی تھیں ؎

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

انہیں کے جواب میں شاید ان کے یہ شعر ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن عام مذاق کے لوگ اور شاعر گلہ کیا کرتے۔ ان کا ابتدائی کلام زبان و بیان اور معانی ہر اعتبار سے دقیق تھا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے عالم دشت کا شیرازہ تھا

شب کو وہ مجلس طراز خلوت ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خار کسوتِ فانوس تھا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشتِ خار اپنا

اس مشکل گوئی اور دقت پسندی کا تجزیہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے محاسن کلام غالب میں بڑے فلسفیانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ غالب کے بہت بڑے طرفدار ہیں، لیکن ذیل کی عبارت میں طرفداری سے زیادہ معقول پسندی ہے :-

"زبان ارضی ہے اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں۔ ان دونوں کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم تیار کرنا ہے۔ شعراء گو تلامیذ الرحمان ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ بھی قدرت نہیں کہ اپنے خیالات کا کامل اظہار کرسکیں۔ جو خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں وہ اصلی لطافت بہت کچھ ضائع ہوئے بغیر روئے خیال سے روئے قرطاس تک نہیں آتے....."

غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہوگیا ہے اور عریاں بدن اندر سے نظر آتا ہے۔ چونکہ مرزا غالب کا موضوع کلام بیشتر فلسفہ ہے یہ مشکل اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ فلسفہ چیز ہی ایسی ہے۔ فلابیر فرانسیسی ناول نگار کا قول ہے: جب میں کانٹ اور ہیگل کو مطالعے کے لئے اٹھاتا ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

دیوانِ غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے۔ تخیل عرصہ امکان میں ہر جانب پرواز کرنے کے بعد واپس آجاتا ہے۔ گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے۔ بہت سے نقاد اس کو کیف شراب پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ حصہ دوم میں ہے یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایک ماں نے گوئٹے سے دریافت کیا کہ اس اشکال کا باعث کیا ہے؟ گوئٹے نے جواب دیا یہی تاریکی تو ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ ان مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے۔ اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہئے کہ اس کے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشتِ آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔" نابغہ کے ذہن کی تخلیق اگر ماوی یا ناظر کو متحیر کردے تو یہ نابغہ کا کمال ہے۔ کسی طرح کا ابہام یا مہمل پسندی نہیں۔ غالب کی صفائی میں بجنوری کی یہ ناطق دلیل ہر طرح سے قابلِ قبول و لائق ایجاز ہے۔

اس مشکل پسندی سے قطع نظر غالب کی اردو غزل اردو کا بہترین سرمایہ ہے۔ اسی کے زیر نظر غالب کو اس زمانے میں قبولِ عام کی دولت ملی ہے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ فقرہ اردو ادب کا ایک تاریخی شعر منثور ہے: "مغلیہ عہدِ حکومت نے ہندوستان کو تین چیزیں بخشی ہیں: تاج محل، اردو اور غالب" غالب کے کلام کے محاسن بڑی تفصیل سے جانچے پرکھے جاچکے ہیں۔ اسی میں تصوف ہے، علوِ خیال ہے، اور زندگی کی نفسیات ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کی ندرت ہے۔ وہ زندگی کو ایک مینارے پر کھڑا ہو کر دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ غمِ روزگار اور غمِ زندگی مترادف ہیں اور اس غم سے فرار کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اسے زندہ سمجھ کر کھیلتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کی بذلہ سنجی اور شوخی ایک گھٹیا قسم کا استہزا نہیں۔ اس سے بھی وہ زندگی کے مسائل پر مذہبی اوہام پر نام کے زہد و اتقا پر طنز کرتے ہیں ؂

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مرزا کے کلام کے بڑے بڑے عناصر ذیل میں درج ہیں، اور ان کے تحت ہر عنصر کی چند مثالیں بھی پیش ہیں،

فلسفۂ عشق و محبت

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

سودا کا مشہور شعر تھا ؂

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ علی حزیں نے اس کی بہت داد دی تھی اور کہا تھا کہ ایک مرغِ قبلہ نما رہ گیا تھا اس کو بھی انہیں چھوڑا، لیکن غالب نے قبلہ کو ہی قبلہ نما کہہ کر اپنی جدت پسندی اور اپنے خیال کی پرواز کو انتہا تک پہونچا دیا۔ یہ شعر تصوف کے ضمن میں بھی لاجواب شعر ہے ؂

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

تصوّف

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

عشق تنگ کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اس ضمن میں داغ کا مشہور شعر ہے ؎

راہبرِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

اور ملاحظہ فرمایئے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

سوز و گداز

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

نہیں ذریعہ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

اب جفا سے بھی ہیں محروم کہ اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ جفا ہو جانا

رندی

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوء ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دیجیے پیمانۂ صہبا مرے آگے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

مرزا رند بلا نوش تھے۔ اس لئے ان کے اشعار اس قبیل کے نہیں جس کے ریاض خیر آبادی کے اشعار ہیں ان کے رندانہ مضامین میں بھی زندگی بول رہی ہے۔ ان کی آتما بول رہی ہے۔ کہیں سوقیانہ پن نہیں۔ ایک آزاد منش شاعر، ثواب، ساقی، مینا، طاعت و زہد وغیرہ پر فلسفیانہ نظر ڈالتا ہے۔ ان سے پہلے رندی کے مضامین اس صفائی، اس لطافت اور اس اخلاص سے اردو شاعری میں کم آئے ہوں گے۔

پہلو دار اشعار

مولانا حالی نے یادگار غالب میں مرزا کی اس خصوصیت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ بعض اشعار میں دو دو معنی بھر دیتے ہیں۔ اس کی مثال اور کسی شاعر کے یہاں اس کثرت سے نہیں ملتی۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

تیرے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

ذوقِ سلیم ان اشعار میں دو دو معنی تلاش کرے گا۔ خوفِ طوالت سے شرح لکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

محاکات

غالب شاعری میں مصوری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں موسیقی کے عناصر ہیں۔ گویا وہ شاعر ہوتے ہوئے تینوں فنونِ لطیفہ کے ماہر ہیں۔ حسن و عشق کو مرزا نے اس خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہو گئیں

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

آواز کی نزاکت کے باب میں مومن کا بھی ایک مشہور شعر ہے ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

لیکن غالب کے یہاں جو محاکاتی رنگ ہے وہ مومن کے یہاں نہیں، اور دوسرا مصرع تو بے پناہ ہے۔ ع
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

پھیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

غالب کا قول ہے کہ انہوں نے مومن سے مصوری سیکھی ہے۔ اور یہ مصوری ان کی شاعری کی جان ہے۔
رشک کے مضامین بھی غالب کے یہاں کثرت سے ہیں۔ اور یہ ان کی اردو اور فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مرزا جعفر علی خاں اثر مرحوم میر کے بہت بڑے مداحوں میں تھے۔ انہوں نے مطالعۂ غالب میں میر و غالب کے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جو ہم معنی ہیں۔ اس توارد کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

غالب: ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر: بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

غالب: جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

میر: مقصد طریق عشق گیا سب نے بعد قیس
لیکن ہوا نہ ایک بھی اس رہ نورد سا

غالب: قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

میر : عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

غالب : کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گو نہیں آتی

میر : میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

غالب : وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

میر : اب پھر ہمارا اُس کا محشر میں ماجرا ہے
دیکھیں تو اس جگہ کیا انصاف داورگر ہے

غالب ذکاوت اور سلامتی طبع دونوں کے مالک تھے۔ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی طرح ڈالی۔ عامیانہ پن اور گھٹیا مضامین سے پرہیز کیا۔ ان کی طبع غیور جو "وبائے عام" میں مرنا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی، شہر میں پست ذوق کو کس طرح قبول کرتی۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کی غزل گوئی کے تمام محاسن بیان نہیں کیے جا سکتے خود اُن کے قول کے مطابق ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

وہ شوخ طبع تھے۔ خیام نے تو صرف اسی پر اکتفا کیا تھا ؎

پس فرق میان من و تو چیست بگو

لیکن یہ کہاں اتنی سی بات پر رک سکتے تھے۔ ایک رُباعی میں کہتے ہیں ؎

یارب تو کجائی کہ بہ ما زر ندہی
آشفتہ چرائی کہ بہ ما زر ندہی
نے نے تو نہ غنائی دنے بے رحمی
بہ مایہ چو مائی کہ بہ ما زر ندہی

شاہکار رباعی ہے۔ اور شوخی طبع کی انتہا۔ ایسا شوخ طبع شاعر اردو پیدا بھی کر سکے گی یا نہیں۔ پھر اس شوخی کے باوصف غالب نے غزل کو کیا نہیں دیا۔ جتنا مطالعہ غالب کا کرتے جاتے ہیں نئے معنی نئے منظر سامنے آتے ہیں۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ غالب سے ابھی ہم پوری طرح ہم آغوش نہیں ہو پائے ؎

ہمہ عمر با تو قدح گیشم و نہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی زکنار ما بہ کنار ما

پروفیسر رشید احمد صدیقی

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

جو لوگ اس جہان سے اٹھ چکے ہیں، اُن میں کچھ ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا اکثر جی چاہا ہے کہ کاش میں ان کی زندگی میں ان سے مل سکتا، ان میں سے ایک غالب ہیں!

غالب کی گرفت مجھ پر اس لئے نہیں ہے کہ وہ بڑے شاعر تھے۔ بڑے شاعر تو اور بھی ہیں۔ میں تو ان سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک عہد تھے، ایک مزاج ایک علامت یا ایک عالم تھے، اور اس کے باوجود ہمارے ہی آپ جیسے تھے۔

بعض احباب کہتے رہتے ہیں کہ وہ ایک زوال آمادہ تمدن یا جاگیردارانہ نظام یا روایتی شاعری "چراغِ رہگذرِ باد" تھے۔ وہ ذہنی انتشار میں مبتلا تھے۔ نئی زندگی کے مطالبات کا نہ شعور رکھتے، نہ اس کے متحمل ہو سکتے تھے۔ یہ الزامات ہیں، اصولی تنقید نہیں۔ یہ آئین نہیں ہے، آرڈی نینس ہے۔ ان دنوں ہم ایک ایسے عالمگیر بحران میں مبتلا ہیں کہ ہم نے تنقید کو اپنی خواہش یا مسلک کا آلۂ کار بنا لیا ہے۔ یہ تنقید کی بڑی محرومی ہے۔ پھر اردو کے ان تذکرہ نگاروں پر کیوں ہنسیئے جو بندھے ٹکے الفاظ میں ہر شاعر کے کلام پر ایک ہی طرح کی رائے دیتے تھے، چنانچہ یہ کہہ دینا میرے نزدیک کافی نہیں ہے کہ غالب ایک زوال آمادہ تمدن یا جاگیردارانہ نظام کی یادگار یا علامت تھے!

عروج یافتہ تمدن کے زوال ہی میں وہ چنگاری ہوتی ہے جو آنے والی نسل کے استعداد عمل کو فروغ دیتی ہے اگر اس نسل سے عمل کی استعداد باقی ہے۔ غالب کا زمانہ دلّی کی شام میں دلی کا نصف النہار تھا۔ تفصیل میں طوالت ہے لیکن اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں دلّی کی سرزمین پر کیسے کیسے جیّد اور یگانۂ روزگار اہل علم و فضل یک لخت نمودار ہو گئے تھے۔ اتنے اور ایسے جو مغلیہ سلطنت کے عروج میں بھی نظر نہیں آئے تھے۔ عظیم تہذیب مرتی نہیں، وہ آنے والی نسل کو کرائسس (crisis) بحران سے عہدہ برآ ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر قوم کے قوائے ذہنیہ و عملیہ پر اس کا ردّ عمل صحیح ہوتا ہے تو یہی عظیم تہذیب نئی نسل کو ایک صالح اور نیا شعور بخشتی ہے۔ پرانے دیئے سے نیا دیا اسی طرح روشن ہوتا ہے۔

مغلیہ سلطنت صرف حکومت نہ تھی وہ ہندوستان کی اخلاقی روایات اور تہذیبی امکانات کو نمو اور تازگی بخشنے کی بشارت تھی جو پوری ہوئی، اور اجتماعی رواداری اور فنون لطیفہ میں کوئی قوم ترقی اور سعادت کے راستے پر چل ہی نہیں سکتی اگر وہ دوسری قوم کے ساتھ دوستی اور رفاقت کا جذبہ اپنے میں نہیں پیدا کر سکتی۔ جن طبعی اور تاریخی عناصر پر ہندوستان مشتمل ہے، اس کا تقاضا یہی رہا ہے کہ وہ یک رنگی میں بوقلمونی اور بوقلمونی میں یک رنگی سے نباہ کرے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں خود ہندوازم کا وسیع مذہبی تصور یہی رہا ہے، ان میں ایک مت دوسرے مت سے علیحدہ ہے۔ ان کے ہاں چھوت چھات بھی ہے۔ ان میں ایسے تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں جہاں انہوں نے خوں ریزی بھی کی ہے۔ پھر بھی ہندوازم کا بنیادی تصور دوسرے عقائد کو انگیز کرتا رہا ہے۔ اور ان کے مذہبی عقیدے نے ان کے اجتماعی عقیدے کی پیروی کی ہے۔

مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا، تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا؛ غالب، اردو اور تاج محل! یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور سوا ہندوستان کے کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں۔

غالب نے طویل عمر پائی، اور اس زمانے میں طویل عمر پائی جو دم بہ دم منہدم اور متغیر ہو رہا تھا۔ وہ میر نہ تھے کہ عہد کے حادثات اور خود اپنے حادثات سے تمام عمر جاں بر نہ ہوئے۔ وہ ذوق نہ تھے کہ شاعری کے ڈھرّے سے جدا نہ ہو سکے۔ وہ مومن تھے کہ حباب پر نقش بناتے رہے۔ وہ ظفر نہ تھے کہ سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی تو شاید شاعری میں کوئی جگہ نہ پیدا کر سکتے۔ ظاہر ہے غالب صرف شاعر نہ رہے ہوں گے، بہت کچھ اور بھی رہے ہوں گے۔

وہ ہر چند فارسی کے بڑے دلدادہ تھے۔ فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور فخر کرتے تھے۔ آگرہ سے دلی آئے تو دلی کے شاعروں اور زباں دانوں سے ٹکر ہوئی۔ کلکتہ گئے تو فارسی دانوں سے پرخاش چھڑی۔ سیاسی دار و گیر کی زد میں آ گئے۔ خاندان کے نزاعی مقدمات میں الجھے رہے۔ ایک سلسلے میں جیل خانے کی معصیت اور رسوائی جھیلی۔ کلکتہ میں مغرب سے آنے والی طرح طرح کی ہواؤں سے سابقہ رہا۔ غدر میں لٹے۔ تنگ دستی نے مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا۔ انگریزوں کی خدمت میں معروضات پیش کئے اور قصیدے گذارے۔ والیان ریاست کے حضور میں گڑگڑائے۔ ان قدروں کو مسمار ہوتے دیکھا جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن نہ وہ میر بنے، نہ فانی، نہ یاس چنگیزی، ــــ وہ تمام حوادث کو

"مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی"

کہہ کر بقول حالی حیوان ظریف (بستم ظریفا!) ہی رہے۔ بستم ظریف ہونا اور رہنا وہ امتیاز ہے جو غالب کے زمانے میں غالب کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا!

غالب کی شخصیت و حیثیت کا تصور کرتے وقت ہم کو یہ باتیں نظر انداز نہ کرنی چاہئیں کہ غالب نے کسی حال میں سوا اپنے کسی اور کی آڑ نہ پکڑی۔ اور اس آڑ پکڑنے میں وہ کہیں بھاگتے چھپتے نہ پھرے۔ ہر طرح کی مشکلات کا

تمام عمر سامنا رہا، لیکن انہوں نے فریاد کی نہ بغاوت، ہر مسماری کے نیچے سے چھپٹے حال، لیکن مسکراتے ہوئے نکلے، نورانی خون گرما جاتا تو اپنے ناقدوں پر جی گھول کر برس بھی پڑتے۔ اردو شاعری میں غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔

غالب کی فارسیت کی طرف اوپر اشارا کیا جاچکا ہے۔ اس بارے میں خود اُن کے بیانات آپ نے سُنے ہوں گے۔ بیدل سے اُن کی عقیدت کو بھی نظر میں رکھئے، ایک فاضل کا یہ قول بھی یاد رکھئے کہ غالب اردو شاعری کا شجرہ دلی پر ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسے خسرو کے واسطے سے رودکی تک پہونچا دینا چاہتے تھے۔ اگر اردو شاعری میں غالب کا بیچ نہ ہوتا تو اردو شاعری اور زبان کا آج رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ بایں ہمہ ہندوستان کی فضا اور دلی کی روایات میں وہی شخص فارسی اور فارسیت سے ہٹ کر اردو نثر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ خط لکھنے کے کیا اصول بتاتا ہے۔ اور اپنے بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو کس عقیدت، محبت اور شفقت سے یاد کرتا ہے۔ اس کا اندازہ غالب کا معمولی سا طالب علم بھی کرسکتا ہے۔ خط لکھنے میں انشا پردازی کی تمام خوبی اور خامی منکشف ہوجاتی ہے۔ انشا پردازی ہی نہیں شخص کی بھی۔ غالب نے کچھ اور نہیں کیا ہوتا صرف یہ رقعات لکھے ہوتے تب بھی وہ ہمارے بہتوں سے اُونچے ہوتے۔ خط لکھنے میں لوگوں نے بڑے بڑے اہتمام کئے ہیں، اپنی قابلیت اور زورِ قلم صرف کیا ہے۔ لیکن پڑھنے پر اکثر یہی محسوس ہوا کہ خط بھی نہ لکھ پائے اور بے نقاب بھی ہوگئے۔ خط لکھنا جو چیز طلب کرتا ہے انشا پرداز اس کے حوالے کرنے میں ہمیشہ ہچکچائے گا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں شخص انشا پردازی کا نہیں خود انشا پردازی شخص کا سہارا لیتی ہے۔ کمتر درجے کا شخص بہتر درجے کا خط نویس نہیں ہوسکتا۔ شبلی نے عطیہ فیضی کو خط نہ لکھے ہوتے تو میں غالب کے بعد ان کو اردو کا سب سے اچھا خط لکھنے والا نہ قرار دیتا۔

غالب نے غزل کو تہذیب کا درجہ دیا جس سے آج ہمارے اچھے سے اچھے شاعر کو مفر نہیں۔ غزل اب اتنی صنف کمال نہیں رہی جتنی وہ اردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی ہے۔ غالب نے نثر اور نظم دونوں کو دلیری بھی دی دلبری بھی ـــ غزل کی تقدیر غالب ہی نے متعین کی، اور اس کو ایسی فضا دی جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری و شاعری کو برگ و بار لانے کے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں۔

اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "مجھے آہ و فغان نیم شب کا پیام آیا۔ ایسا تو نہیں ہے کوئی مشکل مقام آگیا ہو۔" اردو شاعری میں غالب نے اپنے بعد آنے والے شعرا کے لئے یہ مشکل مقامات آسان کردیئے ہیں۔ اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ معرکہ غالب نے غزل کے ذریعے سر کیا، جس کی تنگ دامانی ضرب المثل بن چکی تھی۔ غالب بڑے معرکے کے عہد میں پیدا ہوئے تھے جس کو پورے طور پر سمجھنا اور نظر میں رکھنا غالب ہی کا کام تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ نہ کسی کے پیرو بن سکے تھے اور نہ ان کے عہد میں کوئی اور ان کا پیرو بن سکا۔

اردو شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص غالب کی پیروی اس وقت شروع ہوئی جب ہمارے یہاں پھر سے ہیجان اور ہلچل شروع ہوئی، اور یہ زمانہ جنگ طرابلس اور بلقان سے لے کر آج تک کا ہے۔ اس

پیروی کے اولین نقوش ہم کو شبلی کی غزلوں میں ملتے ہیں۔ غزلوں میں غالب کا یہ کارنامہ ہماری شاعری میں طرح طرح سے جھلکتا ہے۔ جس کی تفصیل بجائے خود ایک مقالہ بن سکتی ہے اور اس کا یہ موقع نہیں۔ اردو شاعری کے طالب علموں کو یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ غالب اردو غزل کے فی نفسہٖ کوئی بڑے ہرد میدان نہ تھے، ان سے پہلے خودان کے عہد میں اور ان کے بعد بھی ان سے زیادہ ممتاز غزل گو گزرے ہیں۔ لیکن یہ غالب ہی کا تصرف تھا جس نے غزل کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو غزل بنا دیا۔ اردو شاعری میں غزل کا یہ تصرف دوام مبارک سمجھا جائے یا نامبارک، حیرت انگیز ضرور ہے۔ اردو شاعری غالب کے سہارے خاصی دشوار گذار منزلیں طے کرتی اقبال تک پہونچی۔ انہوں نے اس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ ایسا موضوع ہے، جس کے بارے میں وہی بات دوہرانا چاہتا ہوں، جو ابھی ابھی اوپر کہہ آیا ہوں، یعنی جس کی تفصیل خود ایک مقالہ بن سکتی ہے، اور اس کا یہ موقع نہیں۔

غالب کے سلسلے میں کچھ باتیں ان کی زندہ دلی اور خوش طبعی کے بارے میں بھی کہنی ہیں۔ ابتذال، ہجو اور پھکڑ کے دور سے اودھ پنچ کی سیاسی و معاشرتی طنز و ظرافت تک ایک زیریں لہر چلی گئی ہے ۔ جسے غالب کی شستہ اور شائستہ ظرافت کو چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ زندگی سے غالب کا رشتہ بالواسطہ اور براہ راست تھا۔ انہوں نے ایک مضبوط چٹان کی طرح لہروں کو طوفان، طوفان کو لہروں میں منتقل ہوتے دیکھا، اور اسی کھیل کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر تفتیش و تحقیق میں پڑنے کے بجائے ان دونوں کو اپنے طور پر سنبھالتے رہے۔ وہ مرغ لائٹ کے بجائے دن کے اجالے کے قائل رہے۔ اپنی اس حیثیت کو منوانے کے لئے غالب کو بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ ایک عرصے تک بجلی کے قمقموں کے آگے ان کی روشنی ماند پڑی رہی لیکن اس "حیوان ظریف" نے جس طرح اور جس حد تک اس مشکل کو آسان کیا میرے نزدیک طنز و مزاح کے حشرو نشر میں ان کی نجات کے لئے کافی ہے۔

ابتدائی دور کو چھوڑ کر جب ان کی زود رنجی ان کی بے نیازی پر اکثر فتح پا جاتی ہے غالب کے یہاں زندگی کا ایک فلسفیانہ احساس ملتا ہے جس میں رنج و راحت دونوں کے لئے گنجائش ہی نہیں بلکہ طلب بھی ملتی ہے جیسے وہ اس کے قائل ہوں کہ ہنگامے ہی سے اس گھر کی رونق کے تمام پہلو ظہور پاتے اور زندگی کا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں۔ نیز یہ کہ ہنگامے سے بیزار یا پریشان ہونا اتنی ہی گھٹیا بات ہے جتنا کہ اس پر ہنس سکنے اور ہنگامے میں جمعیت خاطر دیکھ سکنے اور پا لینے کی صلاحیت پیدا کرنا ایک اعلیٰ اور قابل عمل نظریۂ حیات ہے۔ یہی احساس ہے جس نے رد و قدح، کرختگی اور دل شکستگی کی تنگ و تاریک اور نمناک گلیوں سے نکال کر انہیں ان کی شاعری کے فلسفیانہ توازن اور بے نیازانہ خوش طبعی کی شاہراہ پر لا ڈالا۔

اردو شعر و ادب ہی نہیں، طنز و ظرافت کی محفل میں بھی غالب اس طرح داخل ہوئے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔ تقریباً ہر صدی میں دو ایک بار ایسا اتفاق ہوتا ہے۔ غالب انہیں دلچسپ لیکن ناگزیر اتفاقات میں سے ہیں۔ ان کو کسی خاص دور میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خود ایک دور، ایک عہد یا ایک مزاج ہیں۔ اسی طرح جیسے ان سے پہلے سودا، اور ان کے بعد اکبر کی حیثیت دیکھ اور سمجھ لیں تو اردو طنزیات مضحکات کا پورا سواد تار تار ہو کر ہمارے پیش نظر ہو جائے گا، اور ہمیں وہ تمام مثبت

اور منفی قدریں مل جائیں گی جن کو مختلف صورتوں میں ایک دوسرے سے ربط دے کر تمام دوسرے طنز میں، اور مزاح نگاروں کا خمیر تیار کیا جا سکتا ہے، اور ان کے فن اور کارنامے دونوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ عہد زمانے کے لحاظ سے بھی غالب سودا اور اکبر کے درمیان آئے ہیں۔ اس طرح ان کی حیثیت "برزخ" کی سی ہو گئی ہے۔ جس میں ایک طرف سودا اور اُن کی ذریات اور دوسری طرف اکبر اور ان کے لواحقین ہیں، گو اس عمل یا سفر میں غالب کی حیثیت اپنے کو اس طرح ڈھالتی منواتی ہے کہ اکبر تک پہونچتے پہونچتے جنت و جہنم (برعایت برزخ) کی تفریق مٹتی نظر آنے لگتی ہے۔ اور یہ احساس ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم بھی بس ایک اندازِ بیان ہے۔

مزاح کی طرح غالب کی طنز بھی لطیف ہے۔ گو اتنی براہ راست یا سادہ نہیں۔ ان کے یہاں وہی بات جب تک سادہ اور براہ راست رہتی ہے، ہلکے پھلکے مزاح کا نمونہ معلوم ہوتی ہے لیکن جہاں اس میں معمولی سا زخم بھی آیا طنز کا تیکھاپن اور ظرافت کا ستم پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی اعتماد اور قابو کی مثالیں کوئی حالی سے پوچھے یا ان دوستوں سے جن کے نام غالب نے ہنس ہنس کے خطوط لکھے ہیں، یا ان مقطعوں میں دیکھیے جن میں کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی سخن گسترانہ بات آ پڑی ہے۔ ان کی ظرافت میں کوئی چیز محض شوخی معلوم ہوتی ہے، وہی ان کی طنز میں پہونچ کر نشتر کی طرح چبھتی ہے۔ مثلاً ؎

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہے یُوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

ہے وَلی پوشیدہ اور کافر کھلا

خدا سے کیا ستم جور ناخدا کہیے

کیا بات ہے تمہارے شرابِ طہور کی

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ اور ایسے ہی جانے کتنے اور گوشے ہیں جو غالب کی شخصیت، ان کی ژرف نگاہی اور ان کی بے جھجک حیات شناسی کے لئے چور دروازوں کا کام دیتی ہے، جو شاید کبھی نہ کھلتے نظر آتے اگر ان پر غالب کی معاملے سے پاک خوش دلی اور خوش طبعی روشنی نہ ڈالتی۔

اپنی اس طبعی زندہ دلی سے انہوں نے خود غزل کے مایوس اور حزنیہ لہجے کو کس حد تک پُر امید اور عزم آفریں بنایا، ایک علیحدہ سوال ہے۔ جس کے بارے میں وہی فقرہ یہاں پھر دوہراؤں گا۔ یعنی جس کی تفصیل بجائے خود ایک مقالہ بن سکتی ہے۔ اور اس کا یہ موقع نہیں۔ لیکن جب ہم ادب میں طنز اور ظرافت کی حیثیت و اہمیت متعین کرنے بیٹھیں تو غالب کی مثال ضرور سامنے رکھنی پڑے گی۔ جن کے اس ذہنی رجائیت ہی کی بدولت ادبی دھارے کا رُخ موڑنا اتنا آسان ہوا۔ ورنہ شاید میر کی زبان نہ غالب کے بیان کو سنبھال سکتی، نہ اقبال کے کلام کو ــــ!!

صبا اکبر آبادی

تضمینِ غالبؔ

ہے ایک تابشِ جلوہ سے قدر دانیٔ شمع
کسی کے حسن سے نکلی فسانہ خوانیٔ شمع
شہابِ برقِ تجلی سے ہے جوانیٔ شمع
رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

ادا سکوت کی ہے موت سے ہم آغوشی
سکوت ہی کو سمجھتے ہیں لوگ بے ہوشی
ثبوتِ ہستیٔ انساں کا ہے سخن کوشی
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

نہ ابتدا سے تعلق نہ انتہا سے ہے کام
نہ اپنی مرضی کا آغاز ہے نہ اب انجام
بیانِ خاص نہ اس کا سمجھ سکیں گے عوام
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام
بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

خموش آگ میں تیری جلا ہے اے شعلے
یہ مرگ اصل میں مرگِ وفا ہے اے شعلے
یہ داغ شمع کے دل میں پڑا ہے اے شعلے
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلے
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

ادا جلال کی پیدا گداز کرتی ہے
ملالِ دہر سے دل بے نیاز کرتی ہے
ترے جمال پہ ہر چیز ناز کرتی ہے
ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع

حسین کیوں ہے یہ اُجڑا ہوا دیار نہ پوچھ
فضائے دل کی ادائے شگفتہ کار نہ پوچھ
دیئے ہیں داغ تو اب حالِ داغدار نہ پوچھ
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

یہ خوب روتی ہے مسرور دیکھ کر مجھ کو
جلاتی رہتی ہے از شام تا سحر مجھ کو
رقیب بن کے نہ کیوں آئے یہ نظر مجھ کو
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

افتخار احمد عدنی

پیمانہ بہ پیمانہ

ترجمہ کی نزاکتوں اور دشواریوں سے قارئین واقف ہیں، اگر ترجمہ منظوم ہو تو یہ دشواریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ غالب کے فارسی کلام کا اردو ترجمۂ منظوم جیسا افتخار احمد عدنی صاحب نے کیا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔

تسنیم مینائی

(۱)

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

نشاطِ اہلِ حقیقت شراب خانہ ترا
فسونِ قصۂ بابل بس اک فسانہ ترا

فریبِ حسنِ بتاں پیشکشِ اسیرِ تو ایم
اگر خطست دگر خال دام و دانۂ تست

فریبِ حسنِ بتاں ہم اسیر ہیں تیرے
یہ خط یہ خال یہ گیسو ہیں دام و دانہ ترا

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا
قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

ترا احاطہ ہے اس طرح کفر و ایماں پر
مقیمِ دیر کا مسجود آستانہ ترا

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست
نہ تیز گرمیٔ توسن ز تازیانۂ تست

ہو فکر آسماں پیما تو کیا قصور مرا
کہ وجہ تیزیٔ توسن ہے تازیانہ ترا

کماں ز چرخ و خدنگ از بلا و پر ز قضا
خدنگ خوردۂ ایں صید گہ نشانۂ تست

ہے کس کے ہاتھ میں تیر بلا کمانِ قضا
ہر اک صید زبوں ہے یہاں نشانہ ترا

سپاس جود تو فرض است آفرینش را
دریں فریضہ دو گیتی ہماں دوگانۂ تست

ہے تیری ذات کا احسان آفرینش پر
سپاس نظمِ دو گیتی مگر دوگانہ ترا

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

اسیر شعر سلف کیوں ہے منکر غالبؔ
وہ نغمہ سنج ملا ہے جسے زمانہ ترا

---

(۲)

نقاب کہ آئینِ رہزنی دارد
جمالِ یوسفی و فرِ بہمنی دارد

نقاب دار کا آئینِ رہزنی دیکھو
جمالِ یوسفی و فرِ بہمنی دیکھو

وفائے غیر گرش دلنشیں شدست چہ غم
خوشم ز دوست کہ با دوست دشمنی دارد

یہ اسکی غیر سے چاہت کا ماجرا پوچھو
ہے اسکو دوست سے کس درجہ دشمنی دیکھو

بیادہ گر بودم میل شاعرم نہ فقیہ
سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد

پیوں شراب تو شاعر ہوں میں فقیہ نہیں
ہے عار کیا مری آلودہ دامنی دیکھو

خوشم بیرم ز اکرام خویش و زیں غافل
کہ مے نماندہ و ساقی فروتنی دارد

ہے کیسا رندوں کا اکرام آج ساقی کو
رہا نہ بادہ تو طرزِ فروتنی دیکھو

نباشدش سخنے کش تواں بکاغد برد
برو کہ خواجہ گہر ہائے معدنی دارد

سخن کہاں جو سما جائے حرف کاغذ میں
دہن سے رُلتے گہر ہائے معدنی دیکھو

بیاورید گر اینجا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

جو شہر میں کوئی سمجھے زباں تو لے آؤ
اک اجنبی کے سخنہائے گفتنی دیکھو

مبارک است رفیق ار چنیں بود غالبؔ
ضیائے نیرِ ما چشم روشنی دارد

اگر رفیق سخن فہم ہو مرا غالبؔ
تو میرے نیرِ تاباں کی روشنی دیکھو

(۳)

تا رغبتِ وطن نبود از سفر چہ حظ
آں را کہ نیست خانہ بہ شہر از خبر چہ حظ

الفت نہ ہو وطن کی تو حاصل سفر سے کیا
جسکا نہ گھر ہو شہر میں اسکو خبر سے کیا

از نالہ مستِ زند مدام ہمنشیں برد
چوں نیست مطلبے ز نویدِ اثر چہ حظ

ہوں مست اپنے نالے میں اے ہمنشیں نہ چھیڑ
مطلب ہی کچھ نہ ہو تو نویدِ اثر سے کیا

درہم فگندہ ایم دل و دیدہ را ز رشک
چوں جنگ با خود است ز فتح و ظفر چہ حظ

ہے معرکہ میاں دل و دیدہ رشک میں
برپا ہو خود سے جنگ تو فتح و ظفر سے کیا

دلہائے مردہ را ز نشاطِ نفس چہ کار
گلہائے چیدہ را ز نسیمِ سحر چہ حظ

جو مردہ دل ہیں انکو نشاطِ نفس کہاں
لوٹے ہوئے گلوں کو نسیم سحر سے کیا

زاں سوئے کاخ روزنِ دیوار بستہ اند
بے دوست از مشاہدۂ بام و در چہ حظ

دیوارِ قصر میں کوئی روزن نہیں رہا
بے دوست اب مشاہدۂ بام و در سے کیا

تا فتنہ در نظر نہی از نظر چہ سود
تا دشنہ بر جگر نخوری از جگر چہ حظ

جو فتنۂ نظر سے بچے وہ نظر کہاں
جب تک جگر نہ چاک ہو حاصل جگر سے کیا

باید نبشت نکتۂ غالبؔ بہ آبِ زر
بے آنکہ وجہ مے شود از سیم و زر چہ حظ

ہاں آبِ زر سے لکھ رکھو غالبؔ کی ایک بات
جسکے عوض نہ مے ملے اُس سیم و زر سے کیا

ایک شعر

آئینہ پوچھے ہے اُن سے یہ تماشا کیا ہے ؛ آپ ہی دیکھنا اور آپ ہی حیراں ہونا

—— پیرزادہ روحی قادری حیدر آباد دکن

عرفانہ عزیز

احتسابِ غالب

عصرِ حاضر کے سخن فہم تجھے کہتے ہیں
کہ نہیں کوہ شکن تیشۂ افکار ترا!

یہی طعنہ ہے کہ غالبؔ ہے غرض سے مغلوب
زہر آلودے دجام ہے کردار ترا!

تیرے اصنام خیالات نقوشِ اوہام
محرمِ راز نہیں دیدۂ بیدار ترا!

فکرِ تازہ کے علمدار یہی کہتے ہیں
نقشِ معنی ہے فقط نقش بہ دیوار ترا!

تیرا ماحول ہے محبوسِ تعصب ہر چند
مشعلِ فکرِ جہاں تاب کی تنویر ہے تو!

تیرا وجدان ہے سر رشتۂ معنی کی گرہ
گم شدہ سلسلۂ فکر کی زنجیر ہے تو!

دیدۂ دہر سے وہ خواب ہے ابتک مخفی
دلِ بیدار کے جس خواب کی تعبیر ہے تو!

نغمۂ روح کا افسوں ہے ترے شعروں میں
ہمہ نیرنگ و ہمہ جادوے تحریر ہے تو!

تیری عظمت سے رہا محتسبِ فن قاصر
نکتہ نکتہ تری تحریر کا محبوب سہی!

تیرے افکار نے اُلٹے ہیں حجاباتِ حیات
فکر تیری نگہِ وقت سے محجوب سہی!

خوں بہا ہم سے طلب کرتا ہے دیوان ترا
مقتلِ دہر میں انداز یہ معتوب سہی!

تیرا عرفاں کسی نقّاد کو حاصل نہ ہوا
شیوۂ نقد و نظر خوب بہت خوب سہی!

"مجھ سے اگر پوچھا جائے

کہ ہندوستان کو مُغلیہ سلطنت نے کیا دیا؟

تو میں بے تکلّف یہ تین [۳] نام لوں گا"

غالبؔ - اردو - تاج محل"

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

غالبؔ کے دو [۲] شعر

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غالبؔ نے عبوری دور میں آنکھ کھولی تھی، ایسے زمانے میں
آدمی پرانی دیواروں کو گرتے ہوئے تو آسانی سے دیکھ
سکتا ہے، ان سے محبت ہوتی ہے تو ان کا ماتم بھی کرلیتا
ہے لیکن ان کی تہہ میں سے کسی دیوار کو اٹھتے ہوئے
دیکھنا، ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا - اس کو دیکھ کر
اس سے محبت کرنا اور بھی دشوار ہوتا ہے - یہ اس لئے
کہ دیکھنے والے میں، خود بھی شکست وریخت جاری رہتی
ہے، اس کے اپنے اغراض اور اس کا اپنا ماضی ہوتا
ہے، جس سے قطع تعلق معمولی بات نہیں -

غالبؔ، تقلید اور اجتہاد (صفحہ ۲۵۸)

پروفیسر خورشید الاسلام

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

سید احمد عروج قادری مرحوم کی وفات پر کراچی کے ایک موقر رسالے نے ذیلی ادارتی کالم میں ایک چار سطری نوٹ کے ذریعے اسپر اظہار تاسف کیا کہ پاکستان کے علمی اور صحافتی حلقوں نے نہ اُن کی وفات کی خبر بروقت شائع کی نہ تعزیتی اداریے لکھے اور نہ مرحوم کے بلند علمی مرتبے اور کارناموں کے بارے میں سوانحی یا تاریخی مضامین و مقالات کی اشاعت کا کوئی اہتمام کیا۔

ہمارے محترم دوست حسن مثنیٰ ندوی صاحب نے اسپر مدیر رسالہ کو ایک تفصیلی مکتوب لکھا اور سرہانے رکھ لیا کہ دوسرے دن سپرد ڈاک کر دیں گے اور حسب عادت بھول گئے یہ واقعہ ماہ جولائی ۱۹۸۶ء کا ہے۔ آغاز ۱۹۸۷ء میں حسن اتفاق سے وہ مکتوب اصلی حالت میں میرے ہاتھ لگا۔ ظاہر ہے کہ جواب کی حیثیت سے تو مکتوب اب "قصۂ پارینہ" ہو چکا تھا لیکن اپنے مندرجات اور مضامین کے اعتبار سے اسکے علمی اور فکری مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی یہی نہیں بلکہ راقم الحروف کی داشت میں امتداد وقت سے اسکا اثر تیز اور گہرا ہو گیا تھا۔ معمولی رد و بدل کے بعد اسلئے مکتوب من وعن نذر قارئین کیا جا رہا ہے ———— (تسنیم مینائی)

برادرم، اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور صحت مند رکھے۔

جولائی ۱۹۸۶ء کی اشاعت سے اطلاع ملی کہ سید احمد عروج قادری نے انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل آمدہ آیا۔ وہ میرے بہت قریبی عزیز تھے۔ ہم عمر بھی تھے اور بچپن کے دوست بھی مدت دراز سے ہم دونوں ایک دوسرے سے دور تھے اور اب تو وہ دور سے بھی دور تر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں ان کو نصیب ہوں اور جنت میں عروج ہو۔

مضمون میں جو کچھ اُن کے بارے میں لکھا گیا ہے اس کو پڑھ کے جی بہت خوش ہوا کہ جانے والے کو بھی یاد کرنے والے ابھی کچھ لوگ موجود ہیں، لیکن میں اپنے بیان کے اندازِ تحریر سے نالاں بہت ہوں۔ تحریریں جیسی لکھی جاتی ہیں اُن سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ ذرا لہجہ بدلا اور وہی تحریر "تحسین ناشناس

ہجو ملیح ہوگئی یا دوسروں کی تحقیر و تخفیف کا پہلو اُبھر آیا۔ اکثر نادانستہ ہوتا ہے۔ مگر ہوتا ہے۔

مولانا سیّد احمد عروج قادری کے بارے میں تو آپ ایسا مضمون لکھیے یا لکھوائیے جس سے ان کا حقیق
علمی مرتبہ، ان کا اندازِ فکر، ان کا تحقیقی ذوق اور طرزِ استدلال نمایاں ہوکر سامنے آئے۔ علم و فضل کا حصہ واف
ان کو ملا تھا، وہ ایک بڑے علمی خاندان کے فرد تھے بیشتر اُن کے بزرگ اپنے علم و فضل ہی کی بدولت عہد
قضا پر مسندِ درس و تدریس پر فائز ہوتے رہے ہیں۔ مولانا قاضی سید تبارک حسین قادری اجھری' ان
کے دادا تھے، مولانا سید عبیداللہ قادری اجھری اُن کے والد ماجد تھے، جو پٹنہ (بہار) کی مشہور درسگاہ مدر
شمس الہدیٰ میں استادِ علوم تھے، سیّد احمد عروج قادری نے وہیں تعلیم حاصل کی تھی اور ورثے میں بھی بہ
کچھ پایا تھا۔ ذہانت و فطانت، علمی ذوق، جراتِ اظہار، حوصلہ، اخلاق، جو کچھ بھی تھا وہ خاندا
ہی کا ورثہ تھا۔

وہ اجھر شریف میں پیدا ہوئے تھے ضلع گیا (بہار) کی یہ بستی پچھلے دور تک عالموں، قاضیو
اور صوفیوں کی مشہور بستی رہی ہے اُن کے مورثِ اعلیٰ اسی بستی میں حضرت سیّدنا محمدنِ القاد
(SAYYIDUNA MOHAMMADOND' QADRI) کے نام و لقب
سے مشہور ہیں، کم و بیش سنہ ۹۰۰ھ کے مجاہد عالم و صوفی ہیں، ان کی وفات سنہ ۹۴۰ھ میں ہوئی ا
اجھر ہی میں مدفون ہیں۔ یہ بزرگ شیخ گرامی مرتبت حضرت سیّدنا عبدالقادر الجیلانی الحنبل
کی اولاد امجاد سے تھے۔ مولانا سیّد احمد عروج نسباً "قادری" تھے اور طریقۃً" بھی سلسلۂ قادر
سے منسلک تھے۔ پھلواری شریف ضلع پٹنہ سے بھی ان کا تعلق تھا۔ مولانا ماہر القادری رح
قادریہ سے طریقۃً منسلک تھے اس لئے اپنے آپ کو قادری لکھتے تھے اور اکثر لوگ لکھتے ہیں۔

مضمون میں یہ شکوہ بھی نظر سے گزرا کہ سیّد احمد عروج قادری کی وفات کو سترہ دن (او
زیادہ) ہوچکے ہیں۔ مگر نہ اخبار میں کوئی خبر شائع ہوئی نہ کوئی تعزیتی بیان ہی کسی کا چھپا — کیوں چ
مرنے والا نہ تو یورپ امریکہ یا روس کا کوئی آدمی تھا۔ نہ حکومت کے کسی منصب پر فائز تھ
نہ اُس کا تعلق فلمی ہی دنیا سے تھا۔ وہ تو ایک علمی شخص تھا۔ عالم تھا، ادیب تھا، شا
مصنف تھا۔ پچھلے دنوں اُسی کے صوبے کے اور کتنے اہل علم و دانش مر گئے جو عالم بھی تھے (بہار کے)۔ ا
بھی، ناقد بھی، محقق بھی، اور ایسے نامور بھی جن کے مضامین و مقالات اور کتابیں پڑھ پڑھ
بہت سے لوگ بہت کچھ بن گئے۔ مگر کس نے ان کو یاد کیا اور کس نے کوئی بیان ان کے بارے میں
لہذا یہ شکوہ درست نہیں۔ خبریں ہوں یا تعزیتی بیانات اشخاص کی علمی و فکری، ادبی، تح
یا تحقیقی و تصنیفی بنیاد پر نہیں" ذاتی روابط، گروہی تعلقات یا پروپیگنڈے کی بنیاد پر

ہیں اور چھپتے بھی ہیں۔ مثال میں ایک نام لینا چاہتا ہوں، اور ایک پاکستانی کا نام لینا چاہتا ہوں
حضرت مولانا ابوالجلال ندوی کا نام ایسا زبردست عالم و مفسر و فقیہ اور محقق۔ اقوام گزشتہ کی
تاریخ کا ماہر، لسانیات کا ماہر، آثار قدیمہ کا ماہر، وہ اہل فکر و نظر تھا جس کے مقالات سے
برعظیم قیام پاکستان سے پہلے ہی فیض پا رہا تھا اور قیام پاکستان کے بعد ہی وہ اس دنیا سے اٹھ گیا
کس کو خبر ہوئی اور کس نے مڑ کے دیکھا؟ جہاں گروہی اور قبائلی مزاج پیدا کیا جا رہا ہو، وہاں علم و دانش
کیا چیز ہے؟ جماعتیں تو اب وہ "قبائل" بنتی جاتی ہیں جو ظہور اسلام کے وقت عرب میں پائے جاتے تھے۔ اور
دانشور بھی اب مزاج کے اعتبار سے کچھ اس قسم کے ہوتے جاتے ہیں جس قسم کے شعراء و ادباء اسلام سے پہلے
گزرے تھے۔ ظاہر ہے کہ قبیلے قبیلے کا ایک بت جدا تھا"۔ آپ کا جی چاہے "تھا" کی جگہ "ہے" پڑھ دیجئے
کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس شکوے پر میرا دل دکھا اور زیادہ ہی دکھا۔ یہاں سید احمد عروج قادری سے
کون واقف ہے اور کیوں واقف ہو؟ آپ میں یا آپ کے جیسے چند اور حضرات، یا جماعت اسلامی کے
کچھ ارکان واقف ہوں گے اور انہوں نے بعض کتابیں بھی ان کی پڑھی ہوں گی۔

میں مولانا سید احمد عروج قادری کی وفات پر کوئی تعزیتی تحریر نہیں لکھ رہا ہوں، میں تو ان کے لئے
صرف دعائے مغفرت ہی کر سکتا ہوں سو کر رہا ہوں، انہوں نے جس چیز کو حق سمجھا، اپنے علم و تحقیق کی روشنی
میں اسلامی روش میں اسکی خدمت پورے جذبے سے انجام دی دی۔ وہ ماہنامہ زندگی رام پور کے مدیر
تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور اس لحاظ سے کامیاب زندگی گزار کے جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔
ستر سے کچھ اوپر ان کی عمر تھی۔ اور اب وہ وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں پہنچ کر آدمی توجہ کرنے والوں کی
ہر تعریف سے اور بے توجہی کی ہر تخفیف سے بے نیاز۔ خدا توفیق دے تو ان کی تحریروں اور کتابوں
کو پڑھیئے، علم و دانش اجازت دے تو عالمانہ و دانشورانہ تنقید بھی کیجئے۔ کوئی نیا نکتہ سامنے آ سکتا
ہو تو پیش کیجئے اور کوئی نیا راستہ نکل سکتا ہو تو نکالیے بھی کہ روشنی پھیلے اور کاروان علم و دانش
آگے بڑھے۔ ماضی میں علماء و فقہا اور اہل فکر و نظر کا یہی دستور تھا۔ تحقیق و تفتیش اور تلاش و جستجو
کی اس دنیا میں کسی کی بات بھی حرف آخر نہیں ہے۔ سائنس والوں کی دھوم ہے مگر ان کی کوئی بات
بھی حرف آخر نہیں۔ حرف آخر تو صرف ایک ہے اور وہ ہے کلام اللہ اور تعلیم رسول اللہ۔

میری یہ تحریر اہل زمانہ کی تعزیت میں ہے۔ مولانا سید احمد عروج کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو
لکھا گیا ہے کہ "گمراہ کن تصوف کی فضا میں جنم لینے والے اور ایک سلسلہ قادریہ کے صوفی گھرانے میں
پرورش پانے والے عروج قادری ....." یہ عبارت میرے خیال میں درست نہیں ہے بلکہ سخت گمراہ کن ہے۔

آج بہت سی خانقاہیں ایسی ہونگی اور ہیں جو اپنی کم علمی و کم نظری کی وجہ سے تصوف اور سلاسل تصوف کی حقیقت سے بے خبر ہوں یا گمراہ یا گمراہ کن ہوگئی ہوں لیکن کون سی جماعت کون سا گروہ، کون سا شعبہ اور کونسا ادارہ جدید و قدیم " آج اس مرض سے کلیتہً محفوظ ہے، بہرحال سید احمد عروج کا گھرانہ نسبی اور طریقتی دونوں اعتبار سے کبھی ایسا نہیں تھا جکو گمراہ کہا جائے جیسا مضمون میں بتایا گیا ہے۔ یہ انداز کمیونسٹوں کا تو ہوسکتا ہے جنکی پالیسی ماضی سے منقطع کرنا ہے آپ کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔

ہندوستان کی مشہور درگاہ پھلواری شریف کے پروردہ احمد عروج قادری نے ساری زندگی باطل عقائد اور جاہلانہ رسومات افکار کے خلاف حق تبلیغ ادا کیا، وہ عالم باخبر تھے "۔ یہ عبارت بھی جس تسلسل سے لکھی گئی ہے حد درجہ قابل اعتراض ہے اس میں بے خبری ہی نہیں، بے لگامی بھی دخیل نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں اور پاکستان میں بھی بے شمار خانقاہیں موجود ہیں ان تمام خانقاہوں پر بیک جنبش قلم ایسی یلغار معاندانہ ہی کہی جائے گی۔ تصوّف اور اسکے خانوادوں اور سلسلوں پر بے تحاشا یورش کسی پہلو سے بھی ایماندارانہ قرار نہیں دی جا سکتی، " ہندوستان کی مشہور درگاہ " پھلواری شریف " لکھ کر بات جس طرح کہی گئی ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ اتفاق سے اصلاح کی قیمتی آوازیں پچھلے دور میں اکثیں بیشتر یہیں سے اٹھی ہیں۔ پھلواری شریف کی خانقاہ، ان خانقاہوں میں نمایاں امتیاز رکھتی ہے جن کے یہاں سجادے پر بیٹھنے کے لئے علم و دانش سے آراستہ ہونا شرط ہے۔ آدمی کو اختیار ہے کہ وہ ان کی فکر و نظر سے جتنا چاہے اختلاف کرے مگر علم و دانش کی سطح سے نیچے نہ اترے چہ جائیکہ " باطل عقائد اور جاہلانہ رسوم و افکار " کا فتوئے غیر عالمانہ طور پر صادر کردے مجھے معلوم ہے کہ یہ تاثرات کہاں سے آئے ہیں۔ ماضی میں بھی بڑا ذخیرہ ایسی بے لگامیوں کا موجود ہے مگر آجکل کی سیاسی جماعتوں اور گروہوں پر قیاس کرکے، انھیں کی طرح کی زبان طعن کو ان خانقاہوں کے خلاف اس طرح آزاد نہیں چھوڑنا چاہیئے، یہ روش پہلے بھی خراب تھی آج بھی خراب ہے بلکہ خراب تر ہے۔ نہ یہ انداز تبلیغ مفید ہے نہ یہ طریقہ اچھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خود سیاسی جماعتوں اور گروہوں اور حلقوں کے بارے میں لکھتے وقت بھی احتیاط سے کام لینا چاہیئے کیونکہ یہاں بھی جس بات کو آپ " حق " سمجھ رہے ہوں، فریق کہتیں کہ وہی " حق " ہو۔

مارگولیتھ (MARGOLOUTH) کی تقلید میں ــــ اگر وہی ہادی و رہنما ہو۔ کوئی شخص سلسلۂ قادریہ کو مطعون کرنا چاہے تو شوق سے کرے۔ رہنما چننے سے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔ مدت ہوئی سلسلۂ قادریہ پر اسی شخص نے عیارانہ مضمون لکھا تھا اور سبب یہ تھا کہ برطانوی شہنشاہی جب اپنے شباب پر تھی

تو اسی سے "ٹکر" لینے والے، جہاد کرنے والے، اس کا ناطقہ بند کر دینے والے خاص طور سے افریقہ میں، اسی سلسلے کے اور اسی کی شاخوں کے سرفروش تھے، بلکہ دوسری جگہوں میں بھی اہل تصوّف اور وابستگان طریقت ہی تھے جو اس کے مقابل صف آرا ہوئے، باقاعدہ جنگ کی، جدید سامان جنگ ان کے پاس نہ سہی مگر عزم ان کے پاس تھا انہوں نے دشمنوں کو شکستیں بھی دیں اور جب تک زندہ رہے باطل کے مقابل حق کی دیوار بنے کھڑے رہے۔ اب جو قربان ہونے والے قربان ہو چکے تو حریف جو چاہیں لکھیں، قلم در کف دشمن است، محقق دوراں، معلم زمانہ اور شاید اہل حق بھی وہی قرار پا جائیں جو حریف ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ذہنوں کے پیالوں میں جو زہر انہوں نے انڈیلا ہے لوگ اسی کو "تریاق" سمجھ کر اپنے گرد و پیش چھلکائے پھریں کہ "آنچہ انگریز مرا گفت، ہماں می گویم"۔ لیکن یہ علم و دانش، ذہانت و فراست اور باخبری کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ پچھلے ہی دور کے لوگوں میں دیکھئے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد کی کوشش اگر کی تو وہ بھی کس حلقے سے تعلق رکھتے تھے، اسی حلقۂ تصوّف سے! انگریزوں نے ان کو اہل نجد پر قیاس کیا؟ وہابی کہا۔ گالیاں دیں اور بدنام کیا تو کیوں بدنام کیا؟ بات کچھ تو تھی۔ بعد میں انہیں بدناموں کے ماننے والوں کا نام اہلحدیث قرار پایا اور وہ ان سے علیحدہ ہو گئے۔ "عبقات" پڑھیے اور اس میں دیکھئے کہ وہ بدنام لوگ کیا تھے؟ عبقات اور صراط مستقیم کے بغیر صرف تقویۃ الایمان کے زور بیان سے ایمان کبھی توت نہیں پکڑے گا، نہ حقیقت تک رسائی کا امکان ہی پیدا ہوگا۔

یقین کیجیے لوگ حقیقت آشنا ہرگز نہیں ہو سکتے اگر اس دور میں بھی جب کہ بہت سی ڈھکی چھپی باتیں تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔ انگریزوں کی "پر فریب تحریروں" کے جال سے وہ باہر نہ نکل سکیں۔ یہ لوگ خواہ اس ملک کے رہنے والے ہوں خواہ کسی اور ملک کے، عجم کے باشندے ہوں یا عرب کے، ان سب کو یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ "تحقیق" کی شکر میں لپیٹ لپیٹ کر کیسا زہر دل و دماغ کے پیالوں میں انڈیلا گیا ہے اور برابر انڈیلا جا رہا ہے۔ اس کے زیر اثر تو جو خدمت بھی انجام دی جائیگی وہ کسی اور ہی کی خدمت ہوگی۔ ملت کی کہاں۔ علامہ اقبال نے جب اپنی THESIS لکھی تھی جو اردو میں فلسفۂ عجم کہلاتی ہے تو تھیس لکھتے وقت ان کا گائیڈ لیوپی تھا۔ مگر جب اقبال کا اپنا علم آگے بڑھا تو انہوں نے اس تھیس کے بیشتر حصوں کو خود مسترد کر دیا، وہ اس کے کبھی حامی نہ تھے کہ اس کا ترجمہ شائع ہو۔ وہ سلسلۂ عالیہ قادریہ سے وابستہ تھے۔ شیخ گرامی مرتبت سیدنا عبدالقادر الجیلانی الحنبلی تھے اور توحید کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ اپنے اس دور کا تو ذکر ہی کیا ہے خود اس دور میں بھی ایسے اہل علم، اہل دل اور اہل نظر بمشکل چند ہی دکھائی دیں گے۔ تاریخ دیکھ جائیے۔ یوں چلنے کو تو قلم بہتوں کے چلتے رہتے تھے۔

آج بہت سی خانقاہیں ایسی ہونگی اور ہیں جو اپنی کم علمی و کم نظری کی وجہ سے تصوف اور سلاسل تصوف کی حقیقت سے بے خبر ہوں یا گمراہ یا گمراہ کن ہو گئی ہوں لیکن کون سی جماعت کون سا گروہ، کون سا شعبہ اور کونسا ادارہ جدید و قدیم " آج اس مرض سے کلیتہً محفوظ ہے، بہرحال سید احمد عروج کا گھرانہ نسبی اور طریقتی دونوں اعتبار سے کبھی ایسا نہیں تھا جکو گمراہ کہا جائے جیسا مضمون میں بتایا گیا ہے۔ یہ انداز کمیونسٹوں کا تو ہو سکتا ہے جنکی پالیسی ماضی سے منقطع کرنا ہے آپ کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔

ہندوستان کی مشہور درگاہ پھلواری شریف کے پروردہ احمد عروج قادری نے ساری زندگی باطل عقائد اور جاہلانہ رسومات افکار کے خلاف حق تبلیغ ادا کیا، وہ عالم باخبر تھے"۔ یہ عبارت بھی جس تسلسل سے لکھی گئی ہے حد درجہ قابل اعتراض ہے اس میں بے خبری ہی نہیں، بے لگامی بھی دخیل نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں اور پاکستان میں بھی بے شمار خانقاہیں موجود ہیں ان تمام خانقاہوں پر بیک جنبش قلم ایسی یلغار معاندانہ ہی کہی جائے گی۔ تصوّف اور اسکے خانوادوں اور سلسلوں پر بے تحاشا یورش کسی پہلو سے بھی ایماندارانہ قرار نہیں دی جا سکتی، "ہندوستان کی مشہور درگاہ "پھلواری شریف" لکھ کر بات جس طرح کہی گئی ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ اتفاق سے اصلاح کی قیمتی آوازیں پچھلے دور میں اکثیں بیشتر یہیں سے اٹھی ہیں۔ پھلواری شریف کی خانقاہ، ان خانقاہوں میں نمایاں امتیاز رکھتی ہے جن کے یہاں سجادے پر بیٹھنے کے لئے علم و دانش سے آراستہ ہونا شرط ہے۔ آدمی کو اختیار ہے کہ وہ ان کی فکر و نظر سے جتنا چاہے اختلاف کرے مگر علم و دانش کی سطح سے نیچے نہ اترے چہ جائیکہ " باطل عقائد اور جاہلانہ رسوم و افکار" کا فتوے غیر عالمانہ طور پر صادر کردے مجھے معلوم ہے کہ یہ تاثرات کہاں سے آئے ہیں۔ ماضی میں بھی بڑا ذخیرہ ایسی بے لگامیوں کا موجود ہے مگر آجکل کی سیاسی جماعتوں اور گروہوں پر قیاس کر کے، انھیں کی طرح کی زبان طعن کو ان خانقاہوں کے خلاف اس طرح آزاد نہیں چھوڑنا چاہیئے، یہ روش پہلے بھی خراب تھی آج بھی خراب ہے بلکہ خراب تر ہے۔ نہ یہ انداز تبلیغ مفید ہے نہ یہ طریقہ اچھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خود سیاسی جماعتوں اور گروہوں اور حلقوں کے بارے میں لکھتے وقت بھی احتیاط سے کام لینا چاہیئے کیونکہ یہاں بھی جس بات کو آپ "حق" سمجھ رہے ہوں، ضروری نہیں کہ وہی "حق" ہو۔

مارگولیتھ (MARGOLOUTH) کی تقلید میں ـــــ اگر وہی ہادی و رہنما ہو۔ کوئی شخص سلسلۂ قادریہ کو مطعون کرنا چاہے تو شوق سے کرے۔ رہنما چننے سے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔ مدت ہوئی سلسلۂ قادریہ پر اسی شخص نے عیارانہ مضمون لکھا تھا اور سبب یہ تھا کہ برطانوی شہنشاہی جب اپنے شباب پر تھی

تو اس سے ٹکر لینے والے، جہاد کرنے والے، اس کا ناطقہ بند کر دینے والے خاص طور سے افریقہ میں، اسی سلسلے کے اور اسی کی شاخوں کے سرفروش تھے، بلکہ دوسری جگہوں میں بھی اہل تصوف اور وابستگان طریقت ہی تھے جو اس کے مقابل صف آراء ہوئے، باقاعدہ جنگ کی، جدید سامان جنگ ان کے پاس نہ سہی مگر عزم ان کے پاس تھا انہوں نے دشمنوں کو شکستیں بھی دیں اور جب تک زندہ رہے باطل کے مقابل حق کی دیوار بنے کھڑے رہے - اب جو قربان ہونے والے قربان ہو چکے تو حریف جو چاہیں لکھیں، قلم درکفِ دشمن است، محقق دوراں، معلّم زمانہ اور شاید اہل حق بھی وہی قرار پا جائیں جو حریف ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ذہنوں کے پیالوں میں جو زہر انہوں نے انڈیلا ہے لوگ اسی کو "تریاق" سمجھ کر اپنے گرد و پیش چھلکائے پھریں کہ "آنچہ انگریز مرا گفت، ہماں می گویم" - لیکن یہ علم و دانش، ذہانت و فراست اور باخبری کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ پچھلے ہی دور کے لوگوں میں دیکھئے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد کی کوشش اگر کی تو وہ بھی کس حلقے سے تعلق رکھتے تھے، اسی حلقۂ تصوف سے! انگریزوں نے ان کو اہل نجد پر قیاس کیا؟ وہابی کہا - گالیاں دیں اور بدنام کیا تو کیوں بدنام کیا؟ بات کچھ تو تھی - بعد میں انہیں بدناموں کے ماننے والوں کا نام اہلحدیث قرار پایا اور وہ ان سے علیحدہ ہو گئے - "عبقات" پڑھیے اور اس میں دیکھئے کہ وہ بدنام لوگ کیا تھے؟ عبقات اور صراط مستقیم کے بغیر صرف تقویۃ الایمان کے زور بیان سے ایمان کبھی توت نہیں پکڑے گا، نہ حقیقت تک رسائی کا امکان ہی پیدا ہوگا۔

یقین کیجئے لوگ حقیقت آشنا ہرگز نہیں ہو سکتے اگر اس دور میں بھی جب کہ بہت سی ڈھکی چھپی باتیں تک منظر عام پر آ چکی ہیں - انگریزوں کی "پرفریب تحریروں" کے جال سے وہ باہر نہ نکل سکیں۔ یہ لوگ خواہ اس ملک کے رہنے والے ہوں خواہ کسی اور ملک کے، عجم کے باشندے ہوں یا عرب کے، ان سب کو یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ "تحقیق" کی شکر میں لپیٹ لپیٹ کر کیسا زہر دل و دماغ کے پیالوں میں انڈیلا گیا ہے اور برابر انڈیلا جا رہا ہے - اس کے زیر اثر تو جو خدمت بھی انجام دی جائیگی وہ کسی اور ہی کی خدمت ہوگی - ملت کی کہاں - علامہ اقبال نے جب اپنی THESIS لکھی تھی جو اردو میں فلسفۂ عجم کہلاتی ہے تو تھیس لکھتے وقت ان کا گائیڈ یہودی تھا - مگر جب اقبال کا اپنا علم آگے بڑھا تو انہوں نے اسی تھیس کے بیشتر حصوں کو خود مسترد کر دیا، وہ اس کے بھی حامی نہ تھے کہ اس کا ترجمہ شائع ہو۔ وہ سلسلۂ عالیہ قادریہ سے وابستہ تھے - شیخ گرامی مرتبت سیدنا عبدالقادر الجیلانی الحنبلی بھی اہل توحید کے بہت بڑے علمبردار تھے - اپنے اس دور کا تو ذکر ہی کیا ہے خود اُس دور میں بھی ایسے اہل علم، اہل دل اور اہل نظر بمشکل چند ہی دکھائی دیں گے - تاریخ دیکھ جائیے - یوں چلنے کو تو قلم بہتوں کے چلتے رہتے تھے۔

ماضی میں بھی - اور زبانیں بھی بہت دراز تھیں - مگر ان اہلِ قلم نے فتنوں ہی کو ہوا دی، تفرقہ انگزیاں ہی کیں اور ملّت کو کمزور کیا - میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا آپ کو معلوم ہے سب کچھ۔

گئے گزرے زمانے میں بھی کسی بات کے فیصلے میں علم و دانش کو کتنا دخل حاصل رہا ہے اس کا ایک نمونہ بھی اور شاید تاریخ کا پہلا واقعہ اسی پھلواری شریف کا آپ کو ملے گا کہ ایک سجادہ نشین نے اپنی صوابدید پر بے تکلف سجادگی چھوڑ دی - صاحبِ سجادہ عالم تو تھے مگر نوجوانی کا زمانہ تھا - یہ اپنے بہت بڑے عالم و صوفی باپ کے فرزند تھے، اپنے والد کی اور پھر اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے تھے ان کی مزید تعلیم کا سلسلہ جاری تھا - خاندان ہی کے ایک مشہور بزرگ مولانا حکیم علی نعمت ان کے استاد تھے جو حضرت مولانا عبداللہ غازی پوری اور حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے) کئی سال تعلیم پانے کے بعد صاحبِ سجادہ نے اپنے استاد کے اثر سے حنفی مسلک چھوڑ دیا اور غیر مقلد ہو گئے - ۲۳ سال کی عمر تھی جب وہ سجادگی سے کنارہ کش ہوئے سجادگی ترک کرنے والے بزرگ کا نام حضرت مولانا شاہ محمد عین الحق پھلواری ابن حضرت مولانا شاہ محمد علی حبیب نصر پھلواری تھا - بعد میں یہی بزرگ اپنے علم و فضل کی بدولت "امام اہلِ حدیث" قرار پائے اور لوگ ان کے مقلد ہوئے - مگر سجادگی سے کنارہ کش ہونے پر ان کے بارے میں وہ انداز کبھی کسی نے اختیار نہیں کیا جو آج ہم لوگوں کے دور میں ایک دوسرے کو بے تکلف بُرا بھلا کہنے کا رائج ہو گیا ہے، نہ خود اُنہیں نے کبھی کسی سے یہ کہا کہ میں اہلحدیث ہوں غیر مقلد ہوں تم میری تقلید کرو۔

پھلواری شریف میں جو شخص بھی اپنے لئے کسی مسلک و مشرب کو پسند کرتا تھا اپنے ذاتی علم و تحقیق کی بناء پر کرتا تھا - ان میں باہم اختلافات بھی ہوتے تھے، مگر اختلافات بھی علمی اور تحقیقی ہوتے تھے جیسے ہمیشہ سے علماء و فقہاء کا اصول رہا ہے - کبھی کوئی اختلاف کرنے والا دوسرے کو "گمراہ" نہیں کہتا تھا، نہ اس کو اس طرح "مطعون" کرتا تھا - احناف میں کتنے مسائل ایسے ہیں جن میں امام ابوحنیفہ ایک طرف اور صاحبین اور دوسرے فقہا دوسری طرف ہیں، مگر کبھی کسی نے یہ گمان تک نہیں کیا کہ امام ابوحنیفہ "گمراہ" تھے - لیکن امام ابوحنیفہ اور امام محمد ایک طرف ہو گئے اور امام ابویوسف کی رائے ان کے خلاف ہوئی - مگر یہ نہیں کہا گیا کہ امام ابویوسف "گمراہ" تھے کبھی امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف ایک طرف ہیں اور امام محمدؒ کی رائے اُن کے خلاف مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ امام محمدؒ "گمراہ" تھے - اسی طرح دوسرے فقہا امام نخعی، امام اوزاعی، امام ثوری تھے - ان سب کی اختلافی رائیں موجود ہیں - ان سب کی کتابیں بھی ایک دوسرے کے بعض مسائل و دلائل کی

تردید میں موجود ہیں، مگر کبھی کسی نے ان میں سے کسی کے "گمراہ" ہونے کا فتویٰ صادر نہیں کیا اور نہ "جاہلانہ رسوم و افکار اور عقائد باطلہ" کے تیر ان پر چلائے۔ یہی حال امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اختلافات کا ہے، امام محمد اور امام شافعیؒ کے اور امام مالک اور امام ابواللیث کے اختلافات کا ہے۔ کیا ان میں سے کسی ایک کو بھی گمراہ کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں؟ آخر عقائد باطلہ اور جاہلانہ رسوم و افکار کا انتساب ان میں سے کس کی طرف کیجئے گا؟ — کسی ایک کا نام لیجئے حکومت و سیاست نے بہت کچھ ماضی میں کیا ہے، اور اپنی بات منوانے کے لئے صاحبان اقتدار نے ائمہ کو سزائیں تک دیں۔ یا پھر خوارج کی بے رگیاں نمایاں رہیں — اور بعد میں تو مناظرے کی کثرت نے دلائل کی جگہ زبان درازیاں عام کر دیں — پھر بھی دلائل و براہین ہی کا سر ہمیشہ اونچا رہا۔

یہ خصوصیت بھی صوفیوں ہی کی رہی ہے کہ ان کے مرشدین نے مرتبۂ اجتہاد پر ہونے کے باوجود اپنا کوئی فقہی اسکول علیحدہ قائم نہ کیا نہ ہونے دیا۔ فقہی اسکول جو موجود تھے انہیں میں سے کسی ایک سے اپنے کو وابستہ رکھا تاکہ تفریق پیدا نہ ہو۔ ان میں کوئی حنفی تھا نہ شافعی، کوئی مالکی، کوئی حنبلی، اور اپنے سلاسل و طرق میں بھی جو مدارس کی طرح کردار سازی کے ادارے تھے یہ بات دلوں میں بٹھاتے رہے کہ "الا دینا لنفس واحدہ" تاکہ سلسلوں اور طریقوں کی یہ تقسیم کار توحید کو اور وحدت ملی کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے اس طرز عمل نے خود فقہی اسکولوں کے فرق کو تفریق کی راہ پر جانے سے روکا۔ انحطاط کے زمانے میں اگر یہ نکتہ بھی فراموش ہو گیا ہو، تو دوسری بات ہے۔

تصوف ایسا علم نہیں ہے کہ آپ آنکھ بند کر کے اس کے خلاف جو چاہیں کہہ ڈالیں مارگولیتھ نے اگر اس کے خلاف زبان درازیاں کیں تو اس کا ایک سامراجی مقصد تھا۔ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتی تھی ان کو گروہوں میں بانٹنا تھا، ان کی اسلامی وحدت کو توڑنا تھا اور انکو کمزور کرنا تھا۔ آپ کمزور نہ ہوں گے تو اغیار آپ پر غلبہ کس طرح پائیں گے؟ مگر آپ کا مقصد کیا ہے علامہ ابن تیمیہؒ کو عام طور پر تصوف کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور کم علمی کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے۔ ان کی مناظرانہ تحریروں پر نظر خاص طور سے جاتی ہے اس لئے کہ طبیعتیں مناظرہ پسند ہو کر رہ گئی ہیں۔ مسیحی مبلغین نے بھی اپنے مناظروں سے ذہنی و نفسیاتی و جذباتی تربیت پچھلے دور میں اسی کی دی ہے اور تصنیفی صورتوں میں اس کا "غیر محسوس" انداز اب بھی جاری ہے اگر علامہ ابن تیمیہؒ کی سب کتابیں پڑھنے کا نہ موقع ہو، نہ فرصت اور نہ توفیق۔ تو ایسی صورت میں ان کے مجموعہ فتاویٰ ہی کا مطالعہ کر لیا جاتا تو روشنی یہیں سے مل سکتی تھی۔ وہ تو خود

صوفی صافی نظر آتے ہیں - اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اپنے مجموعۂ فتاوی میں کسی قسم کی "مصلحت اندیشی" یا "مداہنت" کو راہ دی ہوگی کہ حضرت جنید بغدادی رح کی تعلیم تصوف کو انہوں نے عین اسلام قرار دیا - علامہ ابن تیمیہ رح جس چیز کے مخالف ہیں وہ "حلولیوں" کے افکار و تصورات ہیں۔

پھلواری ایک چھوٹی سی بستی ہے - وہاں علم و دانش ہی کی بنیاد پر کئی حلقے بیک وقت موجود رہے ہیں - حنفی بھی، اہلحدیث بھی مقلد بھی غیر مقلد بھی اور صوفی بھی - اور آج بھی بیشتر ایک ہی خاندان میں سب میں، پھلواری کے خانوادے میں مختلف مسلک کے نامور علماء تو ہمارے قریبی عہد میں اور ہمارے سامنے گزرے ہیں - مولانا شاہ محمد عین الحق پھلواروی کا تذکرہ ابھی ہوا کہ اہلحدیث تھے جو امام اہلحدیث ہوئے ان کے ایک بہنوئی مولانا شاہ محمد بدر الدین قادری حنفی صوفی تھے وہ امیر شریعت ہوئے اور دوسرے بہنوئی مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی، یہ بھی حنفی صوفی تھے جو امام شریعت و طریقت ہوئے پھر مولانا شاہ محی الدین قادری، مولانا مفتی محمد عباس پھلواروی، مولانا محی الدین تمنا عمادی، قاضی محمد نور الحسن منعمی، مولانا شاہ غلام حسنین چشتی، مولانا شاہ قمر الدین قادری، مولانا شاہ نظام الدین قادری اور مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی - سب ایک سے ایک عالم و فقیہ اور محقق تھے - ان سب کے عالمانہ و فقیہانہ و محققانہ انداز جدا جدا ہیں، یہ ایک دوسرے سے اختلاف بھی مختلف مسائل پر کرتے ہیں مگر دلائل سے کرتے تھے - ان میں سے آپ کسی ایک کو یا ان کے علاوہ جس کسی کو بھی پسند کر کے اس کے ہمنوا ہو جائیے اور بشوق تمام ہو جائیے مگر دوسروں کو "گمراہ" کہنے کا حق آپ کو حاصل نہیں ہو سکتا - یہ علمی دیانت کے خلاف ہے۔

مولانا سید احمد عروج قادری میں بہت سی خوبیاں تھیں، ان کے مزاج میں بھی تحقیق و تفتیش کا بڑا جذبہ تھا وہ بید محنتی تھے اور نکتہ رس بھی تھے، ان کا قلم خوب چلتا تھا - لیکن جب یہ لکھا گیا کہ برصغیر کی تحریک اسلامی کی صفوں کے اندر مولانا مودودی کے بعد مجتہدانہ نظر اور فقیہانہ فکر کی حامل ایک ہی شخصیت تھی اور وہ احمد عروج قادری تھے، تو پہلے تو جی اور خوش ہوا کہ بڑی بات ہے اتنا اعتراف تو ہوا لیکن پھر یہ احساس ہوا کہ باقی اور تمام لوگوں کو اس جملے نے کتنا گہرا دفن کر دیا - میرے خیال میں جو بات آپ کہنی چاہتے ہیں اس کے لئے جملے کی موجودہ ساخت کچھ درست نہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کے بعد کا فقرہ جو اس میں جوڑا گیا ہے وہ "تکلفاً" اور "مصلحتہً" ہی جوڑا گیا ہے - پھر اس فقرے سے کیا مراد ہے کہ برصغیر میں اسلامی تحریک کی صفوں میں" کیا اور

کوئی تحریک اسلامی نہیں تھی؟ مولانا مسعود عالم ندوی نے پہلی اسلامی تحریک کے نام سے ایک کتاب ہی لکھ دی ہے اور انہوں نے سید احمد شہید کی تحریک کو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کہا ہے۔ آپ کی مراد اگر یہ ہو کہ "موجودہ جماعت اسلامی کی صفوں میں" ایک ہی شخصیت تھی جو ندوی رہی۔ تو آپ کے قلم نے مولانا مودودی کو بچا لینے کی کوشش تو کی مگر مولانا یوسف اور مولانا ابو اللیث اور دوسروں کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ آپ نے کہہ دیا کہ اب کوئی باقی نہ رہا۔ اور جو باقی ہوں یا ہیں تو وہ سب "فقہائے مصلحت اندیشی و مداہنت پسند" ہیں۔ وہی ایک عالم باخبر تھے۔ یعنی سب بے خبر اور یوں نادانستہ ہی سہی آپ کے جملوں نے یہ سارے سنگین الزامات بھی ان باقی لوگوں کے سر عائد کر دیئے۔

خدا کے واسطے اس اندازِ تحریر کو بدلئے اور بدلوائیے! اور تنگ دائروں سے لوگوں کو باہر نکلوائیے دشمن آپ کی تاک میں ہے اور وہ کسی ایک جماعت، کسی ایک گروہ اور کسی ایک پارٹی کا دشمن نہیں، سب کا دشمن ہے۔ گروہ بندیاں پہلے ہی مسلمانوں کو جراحتیں بہت پہنچا چکی ہیں اب اور مجروح یا مذبوح ہونے سے ملت کو بچایئے۔ خطرات سر پر ہیں اور ہوش کسی کو بھی نہیں ہے سو

پھونک دی کس نے یہ بے ہوشی یہاں ایسی کہ ہے ٭ مستِ غفلت بے خبر سے باخبر تک ایک سا

"توحیدِ ربانی" کا نعرہ بھی بہت زبانوں پر آتا ہے مگر حلقوم کے نیچے کتنے کے اترتا ہے اگر اترتا تو کیا توحید کا مظہر، "تفریق" بلکہ تفریق در تفریق ہوتا؟ انتشارِ فکری اور خلفشار ذہنی۔ گروہ بندی اور جماعت سازی کے جنون نے ہمیشہ اغیار ہی کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں، ملت کے نہیں۔ اسلام نے وحدت عطا کی تھی قبائل کو شیر و شکر کیا تھا۔ اختلاف کا سلیقہ سکھایا تھا، قوت برداشت کی پرورش کی تھی جسے صبر کہتے ہیں، تنقید، تمیز اور بے نفسی کی تعلیم دی تھی۔ مگر آج حال کیا ہے؟ —— "جو ہم کہیں وہ حق ہے، جو تم کہو وہ باطل" —— اور اس کا مدعی ہر ایک ہے اور آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ ادعا سراسر کبر و غرور کا مظاہرہ ہے "تکبر" کا اعلان ہے وَاللہ لا یحب المتکبرین۔

معافی چاہتا ہوں، دل کی بیقراری میں قلم سے کیا کیا کچھ نکل گیا۔ مگر کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو لکھنے ہی کی تھیں۔ اسی خیال سے کہ "شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات"

خلیلی صاحب کو میری طرف سے سلام و دعا کہیئے۔ میرے دل میں ان کے جذبے کی قدر بہت ہے۔

والسلام
سید حسن مثنیٰ ندوی

صبا متھراوی

رباعیات

پڑھ

(۱)

گلزار میں پوشیدہ بہاروں کو بھی پڑھ ٭ ظلمات میں ڈوبے ہوئے تاروں کو بھی پڑھ
کتبے تو مزاروں کے سبھی پڑھتے ہیں ٭ تو غور سے ویران مزاروں کو بھی پڑھ

(۲)

سورج کے ضیا پوش حجابوں کو بھی پڑھ ٭ مہتاب کے پر نور نقابوں کو بھی پڑھ
دنیا کی کتابوں کا ہی کیڑا تو نہ بن ٭ آنکھیں ہیں تو قدرت کی کتابوں کو بھی پڑھ

(۳)

کھلتی ہوئی کلیوں کے پیاموں کو بھی پڑھ ٭ جھکتی ہوئی شاخوں کے سلاموں کو بھی پڑھ
ہر پتّے پہ تحریر ہے روداد چمن ٭ خاموش بہاروں کے کلاموں کو بھی پڑھ

(۴)

ہونٹوں پہ نہ آئی ہوئی آہوں کو بھی پڑھ ٭ الجھی ہوئی سانسوں کی کراہوں کو بھی پڑھ
دن میں بھی نظر آتے ہیں اُن کو تارے ٭ مظلوم کی بے نور نگاہوں کو بھی پڑھ

سیکھو

طوفان کی موجوں میں اُترنا سیکھو ٭ تلوار کی دھاروں پہ گزرنا سیکھو
ڈرتے ہیں کہیں موت سے جینے والے ٭ زندہ تمہیں رہنا ہے تو مرنا سیکھو

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم)

نسخ + تعلیق = نستعلیق

(جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مدرسۂ کتابت کی افتتاحی تقریب سے اقتباس)

اُردو زبان جس خط میں لکھی جاتی ہے وہ عربی اور اس کا انداز خط نستعلیق کہلاتا ہے۔ یہ لفظ دراصل "نسخ" اور "تعلیق" دو عربی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ روزمرہ کی بول چال میں "نسخ و تعلیق" کو پورا ادا کرنا مشکل تھا اس لیے زبان کی خراد نے "خ" اور "و" کو چھیل کر ہلکا پھلکا سا لفظ نستعلیق بنا لیا۔

یہ لفظ جن دو لفظوں سے مرکب ہے وہ بھی عربی خط کے دو مستقل انداز ہیں ان میں کا پہلا آج تک زندہ اور بالعموم عربی زبان کے لکھنے میں کام آتا ہے۔ تعلیق کا چلن بہت دن ہوئے کر جاتا رہا۔

یہ دونوں انداز ایک اور اندازِ خط سے بنے ہیں جو عام طور پر کوفی نام سے مشہور اور مدت سے متروک ہے۔

کوفی اندازِ خط اُس عربی خط کی اصلاحی شکل کا نام ہے جو عرب میں اسلام سے پہلے مروج تھی۔ چونکہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کوفہ حکومت کا مرکز اور علوم و فنون کا مخزن قرار پا چکا تھا، اس لیے قدیم خط نے بھی وہاں اپنے پر پُرزے درست کیے اور اس کی نسبت سے کوفی کہلانے لگا۔

اس خط میں اونچائی کم اور گولائی ندارد تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کے اہرام کی بنیادیں بھر کر چھوڑ دی گئی ہیں یا بھاری بھرکم ہاتھ پاؤں بھدے جوڑ، پیوند اور سپاٹ نقشے والے بوتوں کی پلٹن پریڈ کر رہی ہے۔

دسویں صدی عیسوی تک پہنچ کر عجمی میل جول سے عربی کے معیارِ حسن میں سادگی کے ساتھ پُرکاری بھی آ گئی۔ اس کا اثر فنونِ لطیفہ کی دوسری شاخوں کی طرح خط پر بھی پڑا۔ اس صدی کے آغاز یا گیارہویں صدی کے شروع میں بغداد کے ایک وزیر ابنِ مقلہ نے اس مسالے سے تین نئے اندازِ خط ثلث، محقق اور توقیع نکالے اور پھر ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری لمبائی کم کرنے سے نسخ پیدا کیا۔ ابن مقلہ نے اسی پر بس نہ کی بلکہ "محقق" میں نزاکت بڑھا کر "ریحان" اور "توقیع" میں سادگی اور روانی زیادہ کر کے "رقاع" بھی ایجاد کیا مگر ان سب میں نسخ کے اندر رعنائی زیادہ تھی اس لیے فن کاروں نے سب سے زیادہ اس کی طرف توجہ کی اور چودھویں صدی عیسوی میں یاقوت مستعصمی کے ہاتھوں اس خط کے حسن کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں جس قدر خطاط گزرے ہیں وہ سب کے سب یاقوت کے متبع اور پیرو ہیں۔

یوں تو عبداللہ صیرفی، عبداللہ طباخ ہروی اور شمس کاتب شیرازی وغیرہ اس سلسلے کے مشاہیر میں گنے جاتے ہیں مگر شمس شیرازی کا اثر اتنا بڑھا کر نسخ کا ایک انداز "شیرازی نسخ" کے نام سے عرصے تک زبان زد رہا۔

نستعلیق کا دوسرا جزو "تعلیق" عربی میں "لٹکانا" کا مترادف ہے کتابوں کے مشکل الفاظ یا مطالب کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں

اہل علم برجستہ کچھ جملے کتاب کے حاشیوں پر یا بین السطور میں لکھ دیا کرتے تھے اور انہیں "تعلیقات" کہتے تھے۔ عموماً یہ نوٹ اپنے ذاتی استعمال کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اس بنا پر معمولی سادہ خط میں ہوتے تھے۔ خواجہ تاج الدین سلمانی نے اس سادہ و رواں انداز تحریر کے اصول اور ضابطے بنائے اور اسے "خطِ تعلیق" کا نام دیا۔ یہ نام بعد میں مختصر ہو کر صرف "تعلیق" رہ گیا جس طرح "زبان اردوئے معلیٰ" نے رفتہ رفتہ صرف "اردو" کی شکل اختیار کر لی ہے۔

خواجہ میر علی تبریزی نے جو پندرھویں صدی عیسوی کے مشہور خطاط ہیں "تعلیق" میں "نسخ" کی باضابطگی، نزاکت اور لوچ کی رنگ آمیزی کر کے اس کا نام "نسخ و تعلیق" رکھا۔ یہ کام کچھ ایسے مبارک وقت میں انجام دیا گیا تھا کہ نستعلیق سارے خطوں کا ناسخ نہیں تو سب پر حاوی اور اتنا عام ہوا کہ آئندہ اسی سے خط "شفیعا" اور "شکستہ" انداز استخراج کیے گئے۔

نسخ ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد کے ساتھ ہی وارد ہو گیا تھا مگر اس نے مشرقی ہندوستان پہنچ کر ایک مخصوص رنگ اختیار کیا جو "خط بہاری" کہلاتا ہے۔ اس میں ثلث اور توقیع کی آمیزش کے ساتھ کسی قدر کوفی کی شان بھی پائی جاتی ہے اور پٹھانوں کی عمارتوں کی طرح سادگی و قوت کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

اکبر کے ابتدائی عہد سے شیرازی نسخ کا اثر بڑھتا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ نادر شاہ کے حملۂ ہندوستان کے بعد شیرازی و ہندی کی امتزاجی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے سب سے بہتر لکھنے والے قاضی عصمت اللہ خاں دہلوی تھے۔

بہاری اور دہلوی انداز کے ساتھ کشمیری اسکول کا ذکر بھی ضروری ہے کشمیر کی آب و ہوا اور لطافت و حسن نے اکثر ایرانیوں کو بھی اپنی طرف کھینچا ہے خود کشمیریوں میں بھی جمالیاتی ذوق اور صنعت و فن کاری کا زبردست ولولہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے ایرانیوں سے فنِ خطاطی سیکھ کر ایک نئی راہ نکالی۔ اس طرزِ خط میں دہلوی کی سی نزاکت نہ تھی۔ کشمیریوں نے اس کی کمی کو نقاشی سے پورا کرنے کی کوشش کی اور گلکاری میں ہندیوں سے بازی لے گیے۔

نستعلیق خط بابر کی آمدِ ہندوستان سے بہت پہلے یہاں روشناس ہو چکا تھا۔ چنانچہ امیر خسرو مرحوم کی مثنویوں اور دواوین کے چند ایسے نسخے رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے اندر لکھے گئے تھے مگر اس کی حقیقی ترقی اور عام رواج اکبری عہد کے ایرانی خطاطوں کی بدولت ہوا۔ جہانگیر و شاہجہاں کے زمانے میں بھی دیسی اور بدیسی خطاط اس فن کی آبیاری کرتے رہے۔ مگر جس خطاط کا سلسلہ آئندہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا وہ ایران کے شہرۂ آفاق استاد میر عماد حسنی کا ایک بھانجا اور شاگرد آغا عبدالرشید دیلمی ہے۔ یہ عہد شاہجہاں میں وارد ہند ہوا اور تا آخر بادشاہ کی قدردانی کے سایے میں فن کی خدمت کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی ماحول نے عمادی شان میں بھی جدت پیدا کی اور ایک تیکھا انداز لکھنوی نام سے اس بزم میں شریک ہوا۔ میر عوض علی ملیح آبادی کے ساتھ یہ رنگ رام پور پہنچا اور اتنا مقبول ہوا کہ وہاں کے عوام و خواص سب اس خانوادے کے سلسلۂ شاگردی میں منسلک ہیں۔

اس رنگ کے مشہور استاد الٰہی بخش مرجان رقم اور محمد علی خاں خوش رقم ہیں۔ میر احمد حسن مرحوم نے جو منشی علی محمد خاں مرحوم کے استاد تھے الٰہی بخش مرجان رقم ہی سے اصولِ فن سیکھے تھے۔ مگر بعد میں عمادی شان میں لکھنے لگے تھے۔

نستعلیق اپنے نوک پلک کی انتہائی نزاکت اور دوائر و مدات کی سخت اصولی پابندیوں کے باعث روزمرہ کی ضرورت میں آسانی سے کام نہ آسکتا تھا۔ اس لیے محمد شفیع ثانی ایک خوشنویس نے عہدِ شاہجہاں میں ایک اندازِ خط "شفیعا" کے نام سے ایجاد کیا۔ یہ نستعلیق کے دائروں کو لمبا کرنے اور بعض حرفوں کو دوسرے کے ساتھ خلافِ اصول ملا دینے اور شوشوں کی باریکی کو کم کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانی منشیوں نے شفیعا کو اور رواں کرنا چاہا تو نتیجہ شکستہ یا گھسیٹ کی شکل میں نکلا۔ یہ اندازِ خط دوسرے خطوں کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو اردو شاعری میں مرزا غالب کے نسخۂ عرشی زادہ کے اشعار کی ہے۔

کہ جتنا آسان کرنے کی کوشش کیجیے اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں، چنانچہ شکستہ کے ماہروں کی تحریر کا پڑھنا ناواقف کے لیے کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے کم نہیں۔

عرب دنیا کے ایک مشہور خطاط کا نمونۂ کتابت

عربی اردو خط کے مختلف انداز

کوفی انداز خط

فضل العاقل على الجاهل
كفضل البدر
على السها
سلامة الانسان في حفظ اللسان

نسخ انداز خط

زِيادةُ العقلِ على اللسانِ نعمةٌ وفضيلةٌ وزيادةُ اللسانِ على العقلِ بليةٌ ورذيلةٌ

ثلث انداز خط

عاتب اخاك بالاحسان اليه واردد شره بالانعام عليه

ریحان انداز خط

استعداد الاساتذة الاكفاء للعلوم والمعارف مما لابد منه في تربية النشء ضمانا لنجاح

نستعلیق انداز خط

من سامح الايام طابت حياته وقلت احزانه ونعم باله

دیوانی انداز خط

من استبد برأيه ضل ومن استعان بذوي الالباب سلك سبيل الرشاد

رقاع انداز خط

لا شيء اثمن من الحرية ولا سعادة اكبر من القيام بالواجب

بيروت سنه ۱۳۴۷ھ کامل سلیم البابا

سید منظور علی

گذشتہ سے پیوستہ

مترادفات اور ان کا فرق

ستم - ظلم - جور - جفا - بیداد - بیدردی - تعدی

ستم :- فارسی لفظ ہے اور اردو میں اور فارسی دونوں زبانوں میں ہر قسم کے ظلم کے لئے استعمال ہوتا ہے - اگر کسی نے کسی کو قتل کر دیا تو ستم کیا - کسی کا مال و اسباب لٹ گیا تو اس پر ستم ہوا -

سو گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار ؛ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

معشوق اپنے عشاق پر ستم ڈھاتے ہیں - عشاق ستم برداشت کرتے ہیں -

اردو میں ستم کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے -

۱:- آپ بھی ستم کرتے ہیں - مجھے دعوت دی اور خود غائب !

۲:- کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے - جھاڑ ہو رہی ہے - ستم یہ ہے کہ مجھے منہ اندھیرے دفتر کے لئے بس پکڑنا ہے -

۳:- خود آتے نہیں - خط لکھنے کے قائل نہیں - ستم یہ کہ میرے خطوں کا جواب بھی نہیں دیتے -

اردو اور فارسی ستم کرنے والے کے لئے ستمگر - ستمگار - ستم شعار - ستم کار - ستم کیش - ستم راں اور جس پر ستم کیا جائے اس کے لئے ستم کیش - ستم زدہ - ستم کشیدہ - ستم نصیب اور ستم دیدہ مستعمل ہیں -

لطف یہ ہے کہ ان کے معانی میں بھی فرق ہے -

ستمگر : ستمگر مخفف ہے - ستمگار کا - اسلئے دونوں ہم معنی ہیں -

ستم گار : گار فاعلی لاحقہ ہے مثلاً پروردگار (پالنے والا) آموزگار (سکھانے والا) مددگار (مدد کرنے والا) ان کے معنی میں دوام کی جھلک موجود ہے - پروردگار وہ پالنے والا جو ہمیشہ اور ہر حالت میں پرورش کرتا ہے - اسی لئے یہ لفظ خداوند عالم کی صفات میں ہے - آموزگار جو ہمیشہ سکھاتا رہے ہمیشہ نصیحت کرتا رہے - مددگار جو ہمیشہ لوگوں کی مدد

کرتا رہے، اسی لئے ستمگار اس شخص کو کہتے ہیں جو ہمیشہ ظلم ڈھاتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے شعراء نے معشوق کے لئے یہ لفظ مخصوص کر لیا ہے۔

ستم شعار:- شعار عربی میں ابرن (فارسی ابرہ) کو کہتے ہیں یعنی لباس کا بالائی حصہ جو استر کی ضد ہے۔ اسی لئے یہ لفظ فارسی میں ظاہری طور طریقہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ستم شعار اس شخص کو کہیں گے جو بظاہر ظلم کرتا ہو اور بباطن رحمدل ہے لیکن یہ لفظ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایسے شخص کے لئے مستعمل ہے جس نے ستم کو اپنا شعار بنا لیا ہو۔

ستم کار:- ستمکار وہ ہے جسکا پیشہ ہی ظلم ڈھانا ہو۔ کار بمعنی پیشہ اردو میں مستعمل ہے جیسے گلوکار - صداکار - قلمکار - فنکار وغیرہ لیکن فارسی میں کار، ایک فاعلی لاحقہ ہے۔

ستم کیش:- کیش، مذہب کو کہتے ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں ؂

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس لئے ستم کیش وہ شخص ہے جو ظلم و ستم ڈھانے کو اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہو جیسا لوگ اپنے مذہب کو سمجھتے ہیں اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ ستمکار - ستم شعار - ستم کیش معشوق کی صفات ہیں۔

ستم راں:- یہ لفظ مانوس تو معلوم ہوتا ہے اور خصوصاً "ستمرانی" مگر مجھے یقین نہیں کہ اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اسکی تحقیق کرنی پڑے گی۔

بہر حال راں، راندن کا امر ہے۔ فارسی قواعد کے لحاظ سے جب کوئی اسم کسی مصدر کے امر سے ترکیب پاتا ہے تو امر میں فاعلی معنی پیدا ہو جاتے ہیں جیسے باریدن سے دُربار (موتی برسانے والا) بازندن سے نردباز (نرد کھیلنے والا) خوردن سے مردم خور (انسان کو کھا جانے والا)، رفتن سے تیز رو (تیز چلنے والا)، فروختن سے ارزاں فروش (سستا بیچنے والا)

راندن کے معنی ہیں چلانا، ہانکنا جیسے اسپ راندن، قایق راندن، اتو بیل راندن اسی طرح حکم راندن (حکم چلانا، بادشاہی کرنا) استعارے کی ایک صورت ہے۔

ستم راندن بھی استعارہ ہے یعنی ستم کا کاروبار چلانا یا ستم کی گاڑی چلانا اسکا لئے ستم راں وہ شخص ہوا جو ستم رانی کرتا ہو یعنی ستم کو منظم طور سے چلاتا ہو۔ قیاس چاہتا ہے کہ وہ اکیلا نہ ہو بلکہ کچھ اور لوگ اس کے شریک کار ہوں اس لئے یہ لفظ ظالم بادشاہ یا حاکم کے لئے بہت موزوں ہے۔

اب آیئے مظلوموں کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں۔

ستم کش:- کش، امر ہے کشیدن کا۔ ستم کش۔ ستم کھینچنے والا۔ ستم کا بار گراں برداشت کرنے والا۔

ستم کشیدہ:- کشیدہ اسم مفعول ہے کشیدن سے۔ ستم کشیدہ، ستم برداشت کئے ہوئے۔ وہ شخص جس پر ظلم وستم ڈھائے گئے ہوں۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ستم کش پر ماضی میں بھی ظلم ہو چکا ہے اور حال میں بھی ہو رہا ہے۔ لیکن ستم کشیدہ وہ ہے جس پر ماضی میں ظلم ہوا اور ممکن ہے بہت ہوا ہو لیکن اب اسے نجات حاصل ہو چکی ہے اور ظلم کا اثر بھی زائل ہو چکا ہے۔

ستم زدہ:- زدہ، اسم مفعول ہے زدن سے یعنی مارا ہوا۔ ستم زدہ۔ ظلم کا مارا ہوا۔ ستایا ہوا۔ مارا ہوا سے قتل کیا ہوا مراد نہیں ہے بلکہ متاثر مقصود ہے۔ جیسے سیلاب زدہ۔ فاقہ زدہ یعنی سیلاب یا فاقہ سے متاثر۔ ستم زدہ وہ شخص ہے جس پر پہلے کبھی ظلم ہو چکا ہے اور ممکن ہے ظلم کا اثر اب تک زائل نہ ہوا ہو۔

ستم نصیب:- نصیب کے معنی ہیں حصّہ لیکن فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قسمت کے معنی میں مستعمل ہے اور لطف یہ ہے کہ قسمت کے معنی خود بھی حصّے کے ہیں لیکن یہ دونوں الفاظ تقدیر کے معنی میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ اسی لئے ستم نصیب وہ شخص ہے جس کی تقدیر ہی میں ظلم برداشت کرنا لکھا ہو۔ باغ میں رہا تو سایۂ شاخ گل کا افعی ڈستا رہا۔ بہار آئی تو باغبان نے آشیاں جلا دیا۔ صیاد نے گرفتار کیا تو قفس میں بند کر دیا قفس سے چھوٹا تو ہم جنسوں نے منہ پھیر لیا۔ زاغہائے بیابانی کمزور اور بے بس سمجھ کے ٹھونگیں مارنے لگے۔ جان بچانے کے لئے کسی سوراخ میں پناہ لی تو سانپ نگل گیا۔ غرضیکہ ساری عمر ستم ہی سہتے گزری۔

ستم دیدہ:- دیدہ، دیدن بمعنی دیکھنا سے اسم مفعول ہے۔ ستم دیدہ وہ شخص جس نے ستم دیکھا ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے دوسروں پر ظلم ہوتے دیکھا ہے نہیں بلکہ ستم اس پر خود ہوا اور اس کا مزہ اس نے خود چکھا ہے لیکن خفیف سا ظلم اور اس کا اثر بھی دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

ظلم:- ظلم عربی لفظ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو مناسب جگہ سے ہٹا کر غیر منا[سب]
جگہ پر رکھ دینا۔

ایذارسانی یا ستم رانی اس کے مجازی معنی ہیں - مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو کسی مناسب یا جائز فعل سے ہٹاکر نامناسب یا ناجائز عمل میں لگا دینا - ظلمت نفسی کا یہی مطلب ہے یعنی میں نے اپنے نفس کو جائز عمل سے دور کیا اور ناجائز فعل پر مائل ہو گیا۔

بہرحال فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ایذارسانی کے لئے مستعمل ہے - ظالم اسکا اسم فاعل ہے اور اسم اور صفت دونوں طریقوں سے بولا جاتا ہے - ظالم بادشاہ - ظالم حاکم - ظالم سماج - ظالم نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ بچے ایک دوسرے سے گلے مل لیتے - ایک ہی وار میں دونوں کے سر اڑا دیئے یا بقول جگر سو ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

اردو میں پیار سے اس دوست، یا محبوب کو بھی ظالم کہتے ہیں جس کی تیکھی اداؤں سے دل میں ایک کسک سی محسوس ہو۔

مثلاً اظہارِ محبت کر کے ظالم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

جفا:- جفا عربی الاصل ہے اور روگردانی یعنی منہ پھیر لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فارسی اردو میں ظلم و ستم کے معنی میں بولا جاتا ہے - قیاس چاہتا ہے کہ فارسی میں بھی پہلے روگردانی کے معنی میں استعمال ہوا ہوگا مگر چونکہ معشوق کا منہ پھیر لینا عاشق کے لئے سب سے بڑا ظلم ہے اور ایذارسانی سے بیحد مشابہ ہے اس لئے جو لوگ عربی داں نہیں تھے انہوں نے جفا اور ستم کو مترادف سمجھ لیا - اردو نے فارسی کا تتبع کیا لیکن اگر جفا کو ایسے ظلم کے لئے استعمال کیا جائے جس میں تغافل یا روگردانی کی جھلکی دکھائی دے تو اظہارِ خیال کے لئے ایک نیا لفظ ہاتھ آجائے - میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

دشمنی مجھ سے کی زمانے نے ⁂ کہ جفا کار تجھ سا یار کیا

میر صاحب نے جفا کار کے معنی میں استعمال کیا ہے مگر یار جفا کار کے یہ معنی نکلتے ہیں، کہ ایسا معشوق جس کا شیوہ ہی بے منہ پھیر لینا۔

جور:- جور بھی عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی بھی جفا سے ملتے جلتے ہیں، یعنی کسی شخص یا کسی چیز کو ترک کر کے کسی دوسرے شخص یا چیز کی طرف مائل ہو جانا جفا صرف ترکِ تعلقات کا نام ہے لیکن جور ترک تعلقات کے ساتھ ساتھ دوسرے کی طرف میلان کے معنی بھی رکھتا ہے اور ایک عاشق کے لئے اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ جفا اور جور میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جفا عربی میں میرے محدود علم کے مطابق ظلم کے معنی میں نہیں آتا لیکن جور استعارہ "یا مجازاً" ظلم کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

ظاہر ہے غزل میں یہ دونوں لفظ بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے شعرا نے ان کے لغوی معنی کا خیال کئے بغیر مطلقاً "ظلم کے معنی میں استعمال کیا ہے - حالانکہ اگر ان کا فرق ملحوظ رکھا جاتا تو شعر میں لطیف معنی کا اضافہ ممکن تھا - غالباً" اس شعر میں :- سو

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ؛ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

بیداد :- داد فارسی میں انصاف کو کہتے ہیں - بیداد بظاہر داد اور انصاف کا ضد ہوا یعنی ظلم - لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پر بے فارسی میں کسی اسم کی ضد بنانے کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا - یعنی "بے عقل" کے معنی سفاہت، حمق یا بیوقوفی کے نہیں آتے بلکہ اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جس میں عقل کا فقدان پایا جائے یعنی جس میں عقل نہ ہو - اسی طرح بے شرم جس میں شرم نہ ہو، بیکار جسکا کوئی پیشہ نہ ہو، بے غیرت، جس میں غیرت نہ ہو - اسی طرح سے بیدرد، بے عار، بینوا، بیکراں، بے شمار، بیراہ، بیدل، بے وفا بے رحم، بے دماغ، بے خرد، بے پروا وغیرہ - ان میں سے کوئی بھی کسی اسم کا ضد یعنی الٹ نہیں ہے، بلکہ سب کے سب صفت کی حیثیت رکھتے ہیں - اگر اسپر قیاس کیا جائے تو بیداد کے معنی ظالم اور ستمگر کے ہوتے ہیں، لیکن بیداد مستعمل ہے ظلم اور ستم کے معنی میں، اردو میں بھی اور فارسی میں بھی - بہرحال اس ترکیب کی رعایت سے اتنا تو ہونا چاہیئے کہ بیداد اس ظلم کو کہا جائے جس کی نہ کوئی داد ہو نہ فریاد -

تعدّی :- عربی کا یہ لفظ بھی فارسی اور اردو میں ظلم وستم کے معنی میں مستعمل ہے - عربی میں "عَلیٰ" کے ساتھ انہیں معنوں میں آیا ہے لیکن اس کے لغوی معنی تجاوز کرنے کے ہیں، ہم متعدی امراض ان بیماری کو کہتے ہیں جو ایک شخص سے تجاوز کر کے دوسرے تک پہنچ جائیں - اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ تعدی اس ظلم کو کہا جائے جو ایک شخص سے دوسرے شخص تک تجاوز کر جائے بلکہ جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے -

مندرجہ بالا مترادفات میں فرق واضح کرنے کی میں نے ایک حقیر سی کوشش کی ہے - اگر ان کے استعمال میں فرق کا لحاظ رکھا جاتا تو ادائے معانی کے نئے نئے پہلو سامنے آتے جاتے، مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا اور خصوصاً شاعر جس کو قافیہ، ردیف اور بحر کی پابندیاں اجازت نہیں دیتیں کہ وہ الفاظ کے معانی کا فرق ملحوظ رکھے -

بہرحال میں غالب کے دیوان سے چند مثالیں پیش کر رہا ہوں - آپ دیکھیں گے کہ یہ

تمام مترادفات مطلقاً ظلم وستم کے معنی میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اگر کہیں کوئی فرق نظر آجائے تو وہ محض ایک اتفاق ہے۔

لو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ؎ اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد ؎ جس دل پہ مجھ کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ؎ اس قدر دشمن اربابِ وفا ہو جانا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ؎ بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ؎ اک چھیڑ ہے وگرنہ مرا امتحاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز ؎ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں ؎ ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ؎ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھایئے ؎ دشواری رہ وستم ہمرہاں نہ پوچھ

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ؎ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

قطعہ

آجائیں گے تحریر میں کیا آپ کے انداز
ہوں میرے تصرف میں اگر لوح وقلم بھی
کیا حال ہے اب کوچہ وبازارِ وفا کا
لوگو! کبھی آباد تھے اِس شہر میں ہم بھی

پیرزادہ روحی قادری (بھارت)

(خاص برائے فاران)

شعری بھوپالی

حسنِ تغزل

ماہ و انجم ہوں کہکشاں ہوں میں ؛ اُن کے جلوؤں کی داستاں ہوں میں

نقشِ موہوم ہے مری ہستی ؛ میں نہیں ہوں وہاں جہاں ہوں میں

دشمنوں سے مجھے نہیں شکوہ ؛ کشتۂ لطفِ دوستاں ہوں میں

عشق بن کر محیط ہے مری ذات ؛ جس زمیں پر ہوں آسماں ہوں میں

مجھ کو سجدہ کیا ملائک نے ؛ آپ کا سنگِ آستاں ہوں میں

مانعِ دید ہے مری ہستی ؛ اپنے اور اُن کے درمیاں ہوں میں

ایک کو دوسرے سے نسبت ہے ؛ وہ ہیں عنوان داستاں ہوں میں

مسکرانا تو تیری فطرت ہے ؛ تم سمجھتے ہو شادماں ہوں میں

میرا حصہ ہے ان کا غم شعری
بے نیازِ غمِ جہاں ہوں میں

ایک شعر

دم جو گھٹتا ہے تو ہم کھل کے ہنسا کرتے ہیں ؛ ضبط کے مختلف انداز ہوا کرتے ہیں

پیرزادہ روحی قادری

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مولانا آزاد کا شعری ذوق

شعری ذوق کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس کے لئے کوئی اصول یا ضابطہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ میرا ذوقِ شعر آپ کے ذوقِ شعر سے مختلف ہے۔ آپ کو ایک شعر پسند ہے، مجھے نہیں پسند، میں کسی شاعر کو بہت اچھا شاعر مانتا ہوں، آپ اُسے شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ ان تمام حقائق کے باوجود بھی ایک حقیقت ہے کہ بحیثیت مجموعی نقادانِ فن کا خاصی تعداد میں شعراء یا ان کے اشعار کے اچھے یا معمولی ہونے پر اتفاقِ رائے بھی ہے اور یہی اتفاقِ رائے بغیر کسی ضابطے کے، میزان بھی ہے اور معیار بھی۔

آج تو نقد و نظر کا ناقد بہت آگے نکل گیا ہے۔ نثری شاعری بھی معرضِ وجود میں آگئی ہے اور ویسے مولانا شبلی نے بھی کہہ دیا تھا کہ شعر کے لئے وزن کی ضرورت نہیں ہے، تاہم صوتی آہنگ شاعری کا ایک معیار رہا ہے اور اچھے شعر کی پہچان میں صوتی آہنگ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

میرے لڑکپن کے زمانے میں ذوقِ ادب کی پرورش کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ شاعری میں استادی شاگردی یا اصلاحِ شعر کے معاملے کو چھوڑیئے اس کے علاوہ بھی کچھ مدت پہلے تک شعری ذوق کی پرورش ایسے ماحول کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی۔ تھی جو وجدان کی تربیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوسکے ویسے آج بھی مدرسے، کالج یا یونیورسٹی میں استاد چاہے خود شاعر نہ ہو اُس سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ کسی شاعر کا کلام پڑھاتے وقت وہ طلبہ کو محض شعر کے معانی ہی سے آشنا نہ کرے بلکہ ایسا فرض ادا کرے کہ طالبِ علم شعر سے لذت اندوز ہوسکے۔ اور یہ فرض صرف استاد ہی پر ختم نہیں ہوجاتا۔ ادبی محفلوں اور ادبی گفتگو میں بھی اس طرح کی منزلیں طے ہوتی رہتی ہیں۔ جو لوگ شبلی، حالی، سید سلیمان ندوی، ظفر علی خاں، اقبال، حسرت موہانی، غلام رسول مہر، جگر، فراق، مخدوم، جوش، جمیل مظہری، امجد حیدرآبادی، عبدالمجید سالک، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور اس مزاج کے دوسرے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں وہ اس معاملے میں میرے ہمنوا

ہوں گے۔

مولوی سید میر حسن شاعری میں اقبال کے استاد نہیں تھے۔ مدرسے میں ان کے استاد تھے لیکن داغ سے بھی پہلے اقبال کے ذوق و شوق کی پرورش مولوی سید میر حسن ہی نے کی انہوں نے "سرِ آزاد" انہیں سبقاً سبقاً پڑھائی اور "سرِ آزاد" نامی کتاب کا انتخاب۔ یہی ظاہر کرتا ہے کہ مولوی سید میر حسن کے سامنے مقصد کیا تھا۔ اقبال کا ابتدائی کلام دیکھئے اس میں تضمین کے اکثر اشعار وہی ہیں جو اقبال نے "سرِ آزاد" میں پڑھے تھے تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ مولانا آزاد کی ذہنی تربیت بھی ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کی بدولت رچا ہوا ادبی اور شعری ذوق اس ماحول میں بیٹھنے والے کا جزو مزاج بن جایا کرتا تھا۔ ان کے والد مولوی خیرالدین ایک خاندانی عالم تھے۔ مولانا آزاد کا اوڑھنا بچھونا عربی، فارسی اور اردو ہی رہی۔ ذوقِ شعر تو مبداءِ فیاض سے ہی ملتا ہے لیکن ادبی ماحول اور ادب۔ کا مطالعہ اسی ذوق میں جلا پیدا کرتا ہے، چنانچہ کچھ تو ماحول کے فیض سے اور کچھ مطالعہ کتب کے طفیل مولانا آزاد کا شعری ذوق بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں ان کی تخلیق شعر کی صورت میں اہل نظر کے سامنے آیا۔ اسی سلسلے میں مولانا خود اپنے ایک خط[1] میں لکھتے ہیں۔

> ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ بمبئی سے حکیم عبدالمجید فرخ نے جو پنج بہادر نکالا کرتے تھے۔ ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا اور کلکتہ میں بعض شعراء اس کی ماہواری طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے ایک مرتبہ اس کی طرح تھی۔
>
> پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی
>
> میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعر مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے۔

---

[1] مولانا کا یہ خط جو غلام رسول مہر کے نام ہے مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کے عنوان سے اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکا ہے "قومی آواز لکھنؤ اور مدینہ بجنور نے اس پر یہی عنوان دیا ہے۔ یعنی مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر آزاد ہند کلکتہ نے اس خط کا یہ عنوان قائم کیا ہے اپنی ابتدائی شاعری، اخبار نویسی اور علمی اور ادبی سرگرمیوں پر مولانا آزاد کا تبصرہ۔ میں مذکورہ خط کا متعلقہ حصہ مدینہ بجنور (یکم مئی ۱۹۵۰ء) سے نقل کر رہا ہوں مہر صاحب کی وہ کتاب میرے سامنے نہیں ہے جس میں یہ خط چھپا ہے۔

تشنہ بدل ہے آہ کسی سخت جان کی ✽ نکلے صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے دبا تو ہے شامیانہ گرد ✽ شرمندہ میری قبر نہیں پاسبان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ ✽ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ ان کا بارہ تیرہ برس کی عمر کا کلام ہے اور وہ بھی ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں کہا ہوا جب ہندوستان بھر میں داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا اور ان ہی کے انداز میں شعر کہنا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اقبال ایسا شاعر بھی غزل میں اس طرح کے مصرع کہہ رہا تھا:

بولی چیا حضور دوپٹہ سنبھال کر

اس لئے ان اشعار پر تبصرہ کرنے کے عوض میں یہ زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد کے اسی مذکورہ خط میں مندرج خود مولانا کی رائے ان اشعار کے متعلق بیان کردی جائے۔ یہ خط ۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء کا ہے۔ گویا مولانا چھتیس برس بعد ان اشعار کا ذکر کرتے ہوئے ان کے متعلق رائے دے رہے ہیں، لکھتے ہیں:

"یہ اشعار مجھے کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس وقت ان ہی لغویات نے لوگوں کو مسحور کردیا تھا۔ آج بھی جب کہ چھتیس برس گزر چکے ہیں ابھی وہ خوشی پوری طرح محسوس کررہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی۔ جب ارمغان فرخ میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔"

اسی خط میں آگے چل کر مولانا اپنے ایک اور شعر کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ شعر اور اس کا یہ تمام ذکر اکثر مصنفین نے اپنے اپنے مقالات میں بغیر حوالے کیا ہے۔ میں یہ شعر اور واقعہ مولانا آزاد کے لفظوں ہی میں بیان کررہا ہوں جس سے مولانا کی صلاحیت شعر گوئی پر نہیں بلکہ صلاحیت شعر فہمی پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ میرے نزدیک شعر گوئی سے شعر فہمی زیادہ مشکل کام ہے۔

"اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخ رام پوری کلکتے میں مقیم تھے انہیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔

ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو۔

میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی۔ یاد نہ ہو شاد نہ ہو۔ میں نے

وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دیئے۔

کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے میں نے ایک اور شعر کہہ دیا۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات ⁂ میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہیں لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔

اب دیکھیے مولانا نے اس شعر کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ یہ شعر اب کس قدر لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ شعر یقیناً اچھا شعر ہے اور ان تین اشعار سے تو کہیں بہتر ہے جو پہلے درج کیے جا چکے ہیں۔

یہاں مولانا آزاد کی اردو یا فارسی شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں کیونکہ دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے دیا ہوا موضوع "مولانا آزاد کا شعری ذوق" خود اس بحث کا رخ متعین کر رہا ہے اسی لئے یہاں میں ان کے اردو اور فارسی کلام پر بحث نہیں کروں گا ورنہ کہتا کہ مولانا نظم اور غزل کے علاوہ رباعی ایسی ظالم صنف سخن پر بھی قادر تھے سو جس قدر اردو میں لکھی اتنا ہی فارسی میں وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ مولانا کی نثر کے بعض حصے ایسے ہیں جس میں شاعرانہ رنگ موجود ہے اور یہ نثر ان کے رچے ہوئے شعری ذوق کی غمازی کر رہی ہے مثلاً "تذکرہ" کا یہ اقتباس دیکھیے۔ "کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی و سرافرازی کے لئے دل خون ہوا کبھی سبزہ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی باد صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و دره نوردی کی دل میں ہوا سمائی، کبھی آب رواں کی بے قیدی و بے تعلقی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا تو اپنی سنگینی اور بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی ..... بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پست غفلت کسی بڑے ہی تازیانے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا ⁂ در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

لیکن اس قسم کی مثالوں سے اپنی بات میں وزن پیدا کرنا ذرا دشوار ہے اس لئے کہ اردو

نوٹ: تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی ⁂ اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانہ نے رنگ روپ بدلا ایسا ⁂ میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

میں ایسے بہت سے نثرنگار ہیں جن کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل ہے لیکن ان کا شعری ذوق مشکوک ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو معدوم ہے۔ لیکن مولانا آزاد کے بارے میں چونکہ یہ بات نہیں کہی جا سکتی اس لئے میں نے ان کے بیسیوں شاعرانہ نثرپاروں میں سے ایک بطور مثال کے پیش کر دیا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور سے ظاہر ہے مولانا ابوالکلام آزاد کا شعری ذوق منجھا ہوا تھا، بہت بلند تھا۔ متانت اور توازن کی خصوصیات سے لبریز تھا۔ ان کے انتخاب شعر کا معاملہ یہ تھا کہ نثر میں جہاں کہیں شعر یا مصرع لاتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعر یا مصرع اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ ویسی اچھی نثر کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس میں اشعار کی بھی بھرمار نہیں ہونا چاہئے (شاعری پر تنقیدی مضمون کی بات دوسری ہے) لیکن ہمارے یہاں ایک دور ایسا گزرا ہے کہ مصنف اپنی نثر کو جگہ جگہ اشعار سے مزین کرتا چلا جاتا ہے ایسے مصنفین میں نیاز فتح پوری، مولانا غلام رسول مہر اور جناب جوش ملیح آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جوش صاحب کی اشعار سے لبریز نثر تو خیر خاصی تصنع آمیز تحریر کا نمونہ ہے نیاز فتح پوری اور غلام رسول مہر کی نثر میں بھی اشعار کا انتخاب وہ جادو نہیں جگا سکا جو مولانا آزاد کے حصے میں آیا ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا ان اشعار کا انتخاب پہلے سے کر لیتے تھے جو انہیں اپنی مجوزہ تقریر میں استعمال کرنا ہوتے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی اس بات کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچایا لیکن جب ہم مولانا کی نثر پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں موقع و محل کی مناسبت سے برمحل اشعار یا مصرعوں کی شمولیت دیکھتے ہیں تو عبدالرزاق ملیح آبادی کی بات کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں سوال کسی شعر کو نثر میں استعمال کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کے انتہائی برمحل استعمال کا ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب نثر لکھنے کے دوران میں شعر خود بخود یاد آ جائے۔ پہلے سے جمع کئے ہوئے اشعار بے ساختہ پن پیدا نہیں کر سکتے جو موقع اور محل کی مناسبت سے خود بخود یاد آ جانے والے اشعار پیدا کر سکتے ہیں۔ اشعار کے یاد آ جانے کا تعلق صرف ذوق شعر ہی سے نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ حافظے سے بھی ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ تمام ازل سے ایک غیر معمولی حافظہ لے کر آئے تھے۔ غبار خاطر ہی کو لیجئے یہ کتاب کسی کتب خانے میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی جہاں حوالے کے لئے جو کتاب آپ چاہیں مل سکتی ہے۔ یہ کتاب قید خانے میں لکھی گئی۔ وہاں حوالے دیکھنے کے لئے کتابیں کہاں۔ وہاں ان کا حافظہ ہی ان کا کتب خانہ تھا اور ان کا وجدان ہی ان کا رہنما اور اس کتاب میں صرف متنوع اشعار

ہی نہیں، دس دس مسلسل اشعار اس میں موجود ہیں - مولانا کے حافظے کا ذکر کرنے سے اور انہیں کیا حفظ تھا، نثر میں بھی، اور نظم میں بھی، اس کی مثالیں دینے سے بات اپنے مقصد سے دور جا پڑے گی ورنہ ایسی مثالیں ایک دو نہیں ہیں بیسوں ہیں - راقم التحریر کو خود اُن کے حافظے کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا تجربہ ہے - اس سلسلے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں - "ایک دن عرفی کے اس مشہور قصیدے کا ذکر آ گیا۔

جہاں بگردم و دردا بہ ہیچ شہر و دیار ؛ نہ یافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور مولانا نے اس قصیدے کا حسن بیان کرتے ہوئے پورا قصیدہ زبانی سنا دیا۔"

دراصل ان کے حافظے کا ذکر شعر کے تعلق سے اس لیے ضروری ہے کہ شعر کے تعلق سے ان کا حافظہ اور شعری ذوق مل کے ایک اکائی بن جاتے ہیں - اردو میں انہیں میرؔ اور غالبؔ کا کلام بہت پسند اور ان کے سیکڑوں اشعار ان کو زبانی یاد تھے اسی سے ان کے ذوقِ شعر کا اندازہ لگایا جا سکتا۔

اردو اور فارسی کے کسی شعر یا مصرع کے نثر میں استعمال کے متعلق مولانا کی جس خصوصیت نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے یہ ہے کہ جہاں کہیں مولانا نے شعر کا صرف ایک مصرع استعمال کیا ہے اور اس مصرع کو مکمل شعر کی صورت میں دیکھنے کے لئے میں نے پہلا یا دوسرا مصرع تلاش کیا ہے تو میں ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس شعر کا پہلا یا دوسرا مصرع واقعی اس قابل نہیں ہے کہ اس موقع پر استعمال کیا جا سکے یا تو غیر استعمال شدہ مصرع کمزور نظر آیا اور یا دہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس مقام کے لئے موزوں نظر نہیں آیا - یہ مولانا آزاد کے شعری ذوق کی دقت نظری پر دلالت ہے مثلاً "غبار خاطر" کے ایک خط کا یہ حصہ دیکھئے۔

صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

تو فوراً "لبیک لبیک" اور "مرحمت عالی زیاد" کہتے ہوئے

اس دسترخوان کرم پر ٹوٹ پڑیں

یاران صلائے عام است گرامی کنند کارے

اب دیکھئے پہلا مصرع غالبؔ کا ہے - پورا شعر یہ ہے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا ؛ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اب اس شعر سے پہلے مصرع کو نظر انداز کرنا اور موقع و محل کی مناسبت کے پیش نظر دوسرے

مصرعے کو منتخب کرنا مذاق انتخاب کی انتہائی لطافت کی دلیل ہے - دوسرا شعر حافظ شیرازی کا ہے اور مذکورہ مصرع کا پہلا مصرع ہے۔

شہریست پرُ ظریفاں وز ہر طرف نگارے

اس شعر کا دوسرا مصرع یہاں منتخب کرنا پھر اسی مذاق انتخاب یا شعری ذوق کی رفعت کا ثبوت دیتا ہے جس کا ثبوت ہمیں پہلی مثال میں مل چکا ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ نے "امام عشق و جنون" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا جس کے اکثر الفاظ و فقرات آگے پیچھے کر کے ایک ہندوستانی مصنف نے اپنی کتاب کے اوراق سجائے ہیں - میں اپنے اس مضمون کا اختتام ڈاکٹر سید عبداللہ کے مذکورہ مقالے کے ایک اقتباس پر کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا تاکہ ایک تو میری بات مکمل ہو جائے دوسرا استاد محترم کی تحریر ایک بار پھر اپنی اصلی صورت میں قارئین کے سامنے آجائے لکھتے ہیں :-

"ابوالکلام آزاد کا ذوق بھی ایک جام مرکب ہے اس میں دو متضاد لہریں جمع ہو گئی ہیں - ایک تو ان کا اصلی طبعی رنگ، دوسرا ان کا اکتسابی رنگ — ایک میں ان کی جبلت مضطرب نظر آتی ہے دوسری میں ان کے اکتسابات کی جھلک ہویدا ہے - ان دونوں کے اجتماع سے ان دونوں کا ذوقی نظام مرتب ہوا ہے ..... ابوالکلام کے مزاج کے شخصی اور موروثی عناصر سے قطع نظر ان کے مزاج میں دورِ مغلیہ کی تہذیبی اقدار نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا - مذاق کے ان رنگوں کے ساتھ ساتھ ..... عربی ذوق و ذہن کے ریشے بھی سختی سے پیوست ہیں - عربی ذہن کی خصوصیت ہے عقیدت کی محکمی اور مجرد افکار کو مجسم بنا دینے کا رجحان اور مغل ایرانی ذوق کی یادگار ہے تخیلی لطافتوں سے وہ دل چسپی جو ابوالکلام کی تحریروں میں فارسی شاعری سے انتہا درجے کے شغف کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔

اس میں شک کی مطلقاً گنجائش نہیں کہ ابوالکلام آزاد کے نظام ذہنیات و عادات کا بڑا حصہ فارسی کی عاشقانہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری سے اثر پذیر ہوا ہے - گویا اس جام مرکب کا لطیف اثر انہیں فارسی کی شاعری خصوصاً مغل دور کے ادب سے ملا ہے - اور ظاہر ہے کہ اس جام کا تند عنصر دین اور عربی اذواق سے ماخوذ ہے — یوں اس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تخیل میں تندی اور تیزی کے لئے جو طلب تھی اس کی تسکین بڑی حد تک مغلوں کے زمانے کی شاعری نے کی ہے — اور اسی طرح ان کا وہ ذوق

وہیں بیٹھے بیٹھے چند شعر لکھوا دیئے۔

کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے میں نے ایک اور شعر کہہ دیا۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات :: میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہیں لیکن خدا کی قسم عقل بار رہتی کرتی۔

اب دیکھئے مولانا نے اس شعر کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ یہ شعر اب کس قدر لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ شعر یقیناً اچھا شعر ہے اور ان تین اشعار سے تو کہیں بہتر ہے جو پہلے درج کئے جا چکے ہیں۔

یہاں مولانا آزاد کی اردو یا فارسی شاعری پر تبصرہ مقصود نہیں کیونکہ دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے دیا ہوا موضوع "مولانا آزاد کا شعری ذوق" خود اس بحث کا رُخ متعیّن کر رہا ہے اس لئے یہاں میں ان کے اردو اور فارسی کلام پر بحث نہیں کروں گا ورنہ کہتا کہ مولانا نظم اور غزل کے علاوہ رُباعی ایسی ظالم صنف سخن پر بھی قادر تھے سو جس قدر اردو میں لکھا اتنا ہی فارسی میں وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ مولانا کی نثر کے بعض حصے ایسے ہیں جس میں شاعرانہ رنگ موجود ہے اور یہ نثر ان کے رچے ہوئے شعری ذوق کی غمازی کر رہی ہے مثلاً "تذکرہ" کا یہ اقتباس دیکھئے۔ "کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی و سرافرازی کے لئے دل خون ہوا کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے یقینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا تو اپنی سنگینی اور بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی ..... بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پست غفلت کسی بڑے ہی تازیانے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا :: در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

لیکن اس قسم کی مثالوں سے اپنی بات میں وزن پیدا کرنا ذرا دشوار ہے اس لئے کہ اردو

نو تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی :: اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی

مے خانہ نے رنگ روپ بدلا ایسا :: میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

میں ایسے بہت سے نثر نگار ہیں جن کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل ہے لیکن ان کا شعری ذوق مشکوک ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو معدوم ہے - لیکن مولانا آزاد کے بارے میں چونکہ یہ بات نہیں کہی جاسکتی اس لئے میں نے ان کے بیسیوں شاعرانہ نثر پاروں میں سے ایک بطور مثال کے پیش کر دیا ہے۔

جیساکہ گزشتہ سطور سے ظاہر ہے مولانا ابوالکلام آزاد کا شعری ذوق منجھا ہوا تھا، بہت بلند تھا - متانت اور توازن کی خصوصیات سے لبریز تھا - ان کے انتخاب شعر کا معاملہ یہ تھا کہ نثر میں جہاں کہیں شعر یا مصرع لاتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعر یا مصرع اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ ویسے اچھی نثر کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس میں اشعار کی بھی بھرمار نہیں ہونا چاہیئے (شاعری پر تنقیدی مضمون کی بات دوسری ہے) لیکن ہمارے یہاں ایک دور ایسا گزرا ہے کہ مصنف اپنی نثر کو جگہ جگہ اشعار سے مزین کرتا چلا جاتا ہے ایسے مصنفین میں نیاز فتح پوری، مولانا غلام رسول مہر اور جناب جوش ملیح آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جوش صاحب کی اشعار سے لبریز نثر تو خیر خاصی تصنع آمیز تحریر کا نمونہ ہے نیاز فتح پوری اور غلام رسول مہر کی نثر میں بھی اشعار کا انتخاب وہ جادو نہیں جگا سکا جو مولانا آزاد کے حصے میں آیا ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا ان اشعار کا انتخاب پہلے سے کرتے تھے جو انہیں اپنی مجوزہ تقریر میں استعمال کرنا ہوتے تھے - عبدالرزاق ملیح آبادی اس بات کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچا یا لیکن جب ہم مولانا کی نثر پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں موقع و محل کی مناسبت سے برمحل اشعار یا مصرعوں کی شمولیت دیکھتے ہیں تو عبدالرزاق ملیح آبادی کی بات کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے - یہاں سوال کسی شعر کو نثر میں استعمال کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کے انتہائی برمحل استعمال کا ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب نثر لکھنے کے دوران میں شعر خود بخود یاد آ جائے۔ پہلے سے جمع کئے ہوئے اشعار بے ساختہ پن پیدا نہیں کر سکتے جو موقع اور محل کی مناسبت سے خود بخود یاد آجانے والے اشعار پیدا کر سکتے ہیں - اشعار کے یاد آجانے کا تعلق صرف ذوق شعر ہی سے نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ حافظے سے بھی ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ قسام ازل سے ایک غیر معمولی حافظہ لے کر آئے تھے - غبار خاطر ہی کو لیجئے یہ کتاب کسی کتب خانے میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی جہاں حوالے کے لئے جو کتاب آپ چاہیں مل سکتی ہے - یہ کتاب قید خانے میں لکھی گئی - وہاں حوالے دیکھنے کے لئے کتابیں کہاں - وہاں ان کا حافظہ ہی ان کا کتب خانہ تھا اور ان کا وجدان ہی ان کا رہنما اور اس کتاب میں صرف متفرق اشعار

ہی نہیں، دس دس مسلسل اشعار اس میں موجود ہیں - مولانا کے حافظے کا ذکر کرنے سے اور انہیں کیا حفظ تھا، نثر میں بھی، اور نظم میں بھی، اس کی مثالیں دینے سے بات اپنے مقصد سے دور جا پڑے گی ورنہ ایسی مثالیں ایک دو نہیں ہیں بیسوں ہیں - راقم التحریر کو خود اُن کے حافظے کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا تجربہ ہے - اس سلسلے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں - "ایک دن عرفی کے اس مشہور قصیدے کا ذکر آ گیا۔

جہاں بگردم دو ردا یہ پیچ شہر و دیار ؛ نہ یافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور مولانا نے اس قصیدے کا حسن بیان کرتے ہوئے پورا قصیدہ زبانی سنا دیا۔"

دراصل ان کے حافظے کا ذکر شعر کے تعلق سے اس لیے ضروری ہے کہ شعر کے تعلق سے ان کا حافظہ اور شعری ذوق مل کے ایک اکائی بن جاتے ہیں - اردو میں انہیں میر اور غالب کا کلام بہت پسند اور ان کے سیکڑوں اشعار ان کو زبانی یاد تھے اسی سے ان کے ذوقِ شعر کا اندازہ لگایا جا سکتا۔

اردو اور فارسی کے کسی شعر یا مصرع کے نثر میں استعمال کے متعلق مولانا کی جس خصوصیت نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے یہ ہے کہ جہاں کہیں مولانا نے شعر کا صرف ایک مصرع استعمال کیا ہے اور اس مصرع کو مکمل شعر کی صورت میں دیکھنے کے لیے میں نے پہلا یا دوسرا مصرع تلاش کیا ہے تو میں ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس شعر کا پہلا یا دوسرا مصرع واقعی اس قابل نہیں ہے کہ اس موقع پر استعمال کیا جا سکے یا تو غیر استعمال شدہ مصرع کمزور نظر آیا اور یا وہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے اس مقام کے لئے موزوں نظر نہیں آیا - یہ مولانا آزاد کے شعری ذوق کی دقت نظری پر دلالت ہے مثلاً "غبار خاطر" کے ایک خط کا یہ حصہ دیکھئے۔

صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تو فوراً "لبیک" اور "مرحمت عالی زیاد" کہتے ہوئے

اس دسترخوانِ کرم پر لوٹ پڑیں

یاران صلائے عام است گرامی کنید کارے

اب دیکھئے پہلا مصرع غالب کا ہے - پورا شعر یہ ہے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا ؛ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اب اس شعر سے پہلے مصرع کو نظر انداز کرنا اور موقع و محل کی مناسبت کے پیشِ نظر دوسرے

مصرعے کو منتخب کرنا مذاق انتخاب کی انتہائی لطافت کی دلیل ہے - دوسرا شعر حافظ شیرازی کا ہے اور مذکورہ مصرع کا پہلا مصرع ہے۔

شہریست پُر ظریفاں وز ہر طرف نگارے

اس شعر کا دوسرا مصرع یہاں منتخب کرنا پھر اسی مذاق انتخاب یا شعری ذوق کی رفعت کا ثبوت دیتا ہے جس کا ثبوت ہمیں پہلی مثال میں مل چکا ہے۔

استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ نے "امام عشق و جنون" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا جس کے اکثر الفاظ و فقرات آگے پیچھے کر کے ایک ہندوستانی مصنف نے اپنی کتاب کے اوراق سجائے ہیں - میں اپنے اس مضمون کا اختتام ڈاکٹر سید عبداللہ کے مذکورہ مقالے کے ایک اقتباس پر کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا تاکہ ایک تو میری بات مکمل ہو جائے دوسرا استاد محترم کی تحریر ایک بار پھر اپنی اصلی صورت میں قارئین کے سامنے آ جائے لکھتے ہیں :-

"ابوالکلام آزاد کا ذوق بھی ایک جام مرکب ہے اس میں دو متضاد لہریں جمع ہو گئی ہیں - ایک تو ان کا اصلی طبعی رنگ، دوسرا ان کا اکتسابی رنگ - ایک میں ان کی جبلت مضطرب نظر آتی ہے دوسری میں ان کے اکتسابات کی جھلک ہویدا ہے - ان دونوں کے اجتماع سے ان دونوں کا ذوقی نظام مرتب ہوا ہے..... ابوالکلام کے مزاج کے شخصی اور موروثی عناصر سے قطع نظر ان کے مزاج میں دورِ مغلیہ کی تہذیبی اقدار نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا - مذاق کے ان رنگوں کے ساتھ ساتھ..... عربی ذوق و ذہن کے ریشے بھی سختی سے پیوست ہیں - عربی ذہن کی خصوصیت ہے عقیدت کی محکمی اور مجرد افکار کو مجسم بنا دینے کا رجحان اور مغل ایرانی ذوق کی یادگار ہے تخلیقی لطافتوں سے وہ دلچسپی جو ابوالکلام کی تحریروں میں فارسی شاعری سے انتہا درجے کے شغف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس میں شک کی مطلقاً گنجائش نہیں کہ ابوالکلام آزاد کے نظام ذہنیات و عادات کا بڑا حصہ فارسی کی عاشقانہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری سے اثر پذیر ہوا ہے - گویا اس جام مرکب کا لطیف اثر انہیں فارسی کی شاعری خصوصاً مغل دور کے ادب سے ملا ہے - اور ظاہر ہے کہ اس جام کا تند عنصر دین اور عربی اذواق سے ماخوذ ہے - یوں اس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تخیل میں تندی اور تیزی کے لئے جو طلب تھی اس کی تسکین بڑی حد تک مغلوں کے زمانے کی شاعری نے کی ہے - اور اس طرح ان کا وہ ذوق

نشو و نما پاتا رہا جس کی اہم ترین غذا وہ شورش انگیز تخیل ہے جس کا بڑا سرمایہ عرفی، فیضی نظیری اور غالب کی شاعری میں پایا جاتا ہے اور اگر اس کے سرچشمہ ہائے بعید کی تلاش کی جائے تو ہمیں ان کا سراغ حافظ میں مل جاتا ہے۔

(بشکریہ کتاب نما دہلی)

تبدیلیٔ پتہ

رسالہ فاران کا دفتر ۲۱۸، بہادر سے اب ڈی - ۳۵ بلاک ۸ گلشن اقبال کراچی کو منتقل ہو گیا ہے - قارئین مراسلت اب اس نئے پتہ پر فرمائیں - (مدیر فاران)

مجروح سلطان پوری

جس فارسی شعر پر اس نظم کی بنیاد ہے۔ اس کے لئے اردو میں اگر دو چار قافیے ہیں بھی تو انتہائی مجہول قسم کے اس لئے اس مثلث کے ٹیپ کے مصرعوں میں "م" کا التزام کافی سمجھتا ہوں۔
مجروح

"قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

یہ سازِ اولیں دستِ ازل کا ٭ یہ کاتبِ عشق کی پہلی غزل کا
نگارِ علم کا پہلا یہ محرم

در و بامِ حرم پیدا اسی سے ٭ جمالِ بُتِ جہاں آرا اسی سے
اسی کا جلوہ نقشِ ابنِ مریم

یہی تو شمع ہے بزمِ جہاں میں ٭ یہی چوبِ جرس ہر کارواں میں
یہی جادہ بہ منزل گاہِ عالم

زباں[1] دی اس نے برگِ بے زباں کو ٭ لبِ گفتار سنگ و استخواں کو
لکیروں کو ادائے رقصِ پیہم

بنا دے حرف یہ وقتِ رواں کو ٭ ورق پر نقش کر دے رفتگاں کو
قلم کرتا ہے کارِ اسمِ اعظم

[1] بھوج پتر اور دوسرے آثارِ قدیم کے نقوش

اگر دستِ سعادت میں ہے ماموں ؛ نمو کرتا ہے مثلِ شاخِ زیتوں
بیاضِ شعلہ پر لکھتا ہے شبنم
خم حرف اس کا محرابِ ہنر ہے ؛ سیاہی سُرمۂ اہلِ نظر ہے
جو نقطہ ہے وہ خالِ روئے آدم
یہ انساں جو امیر بحر و بر ہے ؛ قلم لے لو تو پل میں جانور ہے
کسی بن میں کہیں کرتا پھرے رم
یہ نکتہ سربراہوں کو بتاؤ ؛ یہ مصرع کج کلاہوں کو سناؤ
قلم شمشیر پر بھی ہے مقدم
قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

مگر اہلِ قلم کی خود یہ توقیر ؛ جسے دیکھو وہی عبرت کی تصویر
کرے تاریخ بھی کس کس کا ماتم

فلاطون وارسطو، شیخ[1] و رازی ؛ خرد نے جن سے سیکھی نے نوازی
سَر ان کے بھی کسی دربار میں خم
وہ فردوسی و سعدی ہوں کہ خسرو ؛ بہت دیکھی ہے ان کی بھی تگ و دو
خود آوارہ، بساطِ رزق درہم
جنابِ میر و سودا مثلِ غالب ؛ رہے نانِ شبینہ ہی کے طالب
سبھی کے ہاتھ ایک لقمہ رہا کم
نشانِ عہدِ حاضر، جوش و اقبال ؛ نہ بدلا ان کی صبح و شام کا حال
قلم ان کے بدل دیتے تھے موسم

---

[1] شیخ بو علی سینا، اطباء انہیں شیخ ہی کہتے ہیں۔

غرض ارباب دانش، اے خداوند ⁂ کہاں تک جنس بازاری کے مانند
قلم کو بیچ کر کھاتے رہیں غم

گئی شاہی تو اب ہے زخم خواری ⁂ ہماری چارہ جو سرمایہ داری
لہو لیتی ہے تب دیتی ہے مرہم

قلم کو کہیئے کیا اس دستِ بد میں ⁂ عصائے خضر ہے گویا لحد میں
کہ افعی ہے کفِ وحشی میں برہم

کہاں صنعت میں اس پُرفن کی تمثیل ⁂ قلم ہی میں قلم کی گاڑ کر کیل
بناتی ہے صلیب ابنِ آدم

نہ پہچانا جو داغ اپنے لہو کا ⁂ نہیں کھینچا جو دامن فتنہ جو کا
تو پھر کیا ہے علاجِ چشمِ پُرنم

(بشکریہ کتاب نما دہلی بھارت)

غزل

عرفان پربھنوی

اک یہی وعدہ نبھانے کے لئے زندہ ہوں ⁂ دلیش کا قرض چکانے کے لئے زندہ ہوں
آگ نفرت کی بجھانے کے لئے زندہ ہوں ⁂ پیار کے پھول کھلانے کے لئے زندہ ہوں
لوگ دنیا میں فقط اپنے لئے جیتے ہیں ⁂ اور میں صرف زمانے کے لئے زندہ ہوں
جانا ہوتا تو چلا جاتا کبھی کا، لیکن ⁂ غمِ الفت کو نبھانے کے لئے زندہ ہوں
اپنے غم کی تو مجھے فکر نہیں ہے یارو ⁂ غم زمانے کے اٹھانے کے لئے زندہ ہوں

دل میں باقی ہے تو بس ایک ہی حسرت عرفان
غیر کو اپنا بنانے کے لئے زندہ ہوں

یادِ رفتگاں

۱:۔ آصف علوی مرحوم

میرؔ نے کہا تھا:۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا ؎ عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

آصف کی وفات کی خبر میرے واسطے بھی "عجب اک سانحہ سی تھی" یقین ہی نہیں آتا تھا، جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ خبر صحیح ہے۔ چھ آٹھ مہینے پہلے تک وہ سعودی عرب میں پہلے بسلسلۂ ملازمت پھر بطور مشیرِ اعلیٰ شعبۂ جہازرانی سے منسلک تھے۔ ہر سال بلکہ کبھی سال میں دو مرتبہ مکمل طبی معائنہ، شرائط ملازمت ورجوع بخدمت رہنے کے لئے مستلزم تھا۔ پیٹ میں کبھی کبھی درد رہنے لگا تھا، سو اس کے لئے کئی بار چیک اپ (CHECK-UP) کرایا اور ہر دفعہ معائنہ طبیب نے "سب ٹھیک ہے" کا مژدہ سُنایا۔ یہاں آنے کے بعد وہ تکلیف نہ صرف عود کر آئی بلکہ بار بار ہوئی اور جلد جلد اب جو معائنہ کرایا تو کینسر نکلا اور مایوسی ہوئی تو مسموم ٹھہرا۔ اللہ کے فضل اور ان کے سلیقے، نیک نامی اور خوش خلقی کے باعث معائنے اور علاج معالجے کا باہر جلدی اطمینان بخش انتظام ہوگیا اور ایک دن سُنا کہ وہ لندن گئے۔ پھر دو چار روز بعد خوشخبری ملی کہ علاج شروع ہوگیا ہے اور معالجین نے اطمینان دلایا ہے کہ مرض ابھی بڑھا نہیں ہے انشاءاللہ جلدی قابو میں آجائے گا۔

تقریباً دو یا تین ہفتے بعد سلیمان مینائی (میرے سب سے چھوٹے بھائی جو انگریزی ڈان میں سینئر پوزیشن میں ہیں) نے ذکر کیا کہ حلیم (سلیمان کے برادر نسبتی، آصف مرحوم کے بڑے داماد) نے ہندوستان سے فون کرکے بتایا ہے کہ مریض تقریباً صحت پا چکا ہے اور انشاءاللہ دو ایک ہفتے میں پاکستان واپس جانے کی اجازت مل جائے گی۔ دوسرے یا تیسرے دن وفات کی اطلاع آگئی اور پھر معلوم ہوا کہ میت فلاں روز پی آئی اے سے آرہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون یااللہ یہ کیا ہوگیا اور کیسے لیکن یہ سب خیالات تو کمزوریٔ ایمان کی بناء پر تھے۔ سیدھی بات

یہ ہے کہ وقت آگیا تھا، مشیتِ الٰہی یہی تھی - میت آجانے پر ڈیفنس کی مسجد طوبیٰ میں نماز
ہوئی - ہزاروں آدمی تھے - عزیز اقارب و احباب میں سے تو قریب قریب کوئی رہا نہیں تھا
غیروں میں بھی غریب و امیر گمنام و معروف، گوشہ نشین اور اربابِ اقتدار سبھی کی نمائندگی تھی -
میں سمجھتا تھا، خدمت کرتے ہوئے باہر کے ملکوں میں رہتے ہوئے بہت مدت ہوگئی ہے اب اپنوں
اور غیروں کو بھلا ان کے تعلیمی اور مسابقتی کارنامے، رائل بحریہ کے لئے شاندار کامیابی اور انتخاب
پیشہ وارانہ مہارت کے اعترافی اعزازات و تمغے، پھر دوسری جنگ کے آخری دور میں جب جاپان
سواحلِ ہند پر ہلاکو اور چنگیز کے عساکر کے مانند امنڈ آیا تھا - ہندوستانی بحریے کے خون کو
گرما دینے والا ریکارڈ جس میں آصف مرحوم کا حصہ کسی سے کم نہیں تھا - یہ سب کچھ
کہاں یاد ہوگا اور وہی دو سو چار سو آدمی زیادہ تر عزیز و اقارب جمع ہو جائیں گے - مگر

سو مر کے جو ہر آپ کے جو ہر کھلے

قبرستان سے واپسی پر عزیز و اقارب، مرحوم کی بیوی سے تعزیت کرنے امنڈ گئے تو دیکھا کہ
مردانے سے زیادہ زنانہ ہجوم ہے۔ بے اختیار دل سے مرحوم کے لئے مغفرت کی، علوئے مراتبِ اخروی
کی دعا نکلی کہ ملازمت سے سبکدوشی، وطن سے برسوں سے دوری کے باوجود یہ ہر دل عزیزی، خوش
اطواری، خوش خلقی اور خوش باشی کے بغیر نصیب نہیں ہوتی

قصہ طولانی ہو جائے گا مگر دلچسپ ہے مختصر مختصر سن لیجئے، میری ان سے دور کی رشتہ داری تھی،
ویسی ہی جیسے نقی علی مرحوم سے تھی، آصف مرحوم کے عم زاد اوّل تھے، مگر نقی مرحوم سے بچپن سے
ساتھ رہا تھا، جو کالج تک پھر کالج سے حیدرآباد دکن تک برقرار و باقی رہا اور مستحکم سے مستحکم ہوتا
گیا - آصف سے وہاں ملاقات نہیں ہوئی - ڈفرن میں جب وہ دھوم سے کامیاب ہوئے تو
اطلاع ہمارے یہاں بھی آئی اور سب خوش ہوئے - پھر جب سعیدہ ان سے منسوب ہوگئیں تو
مصطفےٰ احمد چچا مرحوم نے سعیدہ سلمہا کے نانا (جو حضرت امیر مینائیؒ کے بھانجے ہوتے تھے) انہوں
نے تحریر لکھ کر مطلع کیا۔

راقم الحروف پہلے اکیلا پھر بقیہ افرادِ خاندان بھی دکن ہجرت کر گئے اس لئے آصف مرحوم سے
تعارف و ملاقات اور پھر ذاتی تعلقات کی منزل یہاں پاکستان میں آئی اور غالباً پہلی ملاقات
مرحوم محمد مشیر (میرے بہنوئی) کے گھر پر ایک تقریب کے اجتماع میں ہوئی - رشید رزاقی مرحوم
بھی موجود تھے انہوں نے وہ قصہ جڑ دیا جو خواجہ شہاب الدین سے میری پہلی ملاقات کا تھا -

پھر کیا تھا، جب تک تقریب جاری رہی ہم مصروف گفتگو رہے - اس وقت پاکستان نیوی کے کمانڈر انچیف کی خدمت کے لئے ان کا نام برملا لیا جاتا تھا - مرحوم نے مجھ سے میری قیام گاہ کا پتہ لیا اور خلوص اور اصرار سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بار بار اور جلدی جلدی ملاقاتیں ہونی چاہئیں۔ کچھ دن واقعی یہ ہوا لیکن وہ جلد ہی آسٹریلیا بھیج دیئے گئے اور پھر مسلسل پھرکی ہو گئے، کبھی یورپ میں متعین کبھی سری لنکا کی حکومت کی خواہش پر ان کی بحریہ کی تنظیم نو کے لئے حکومت کے مشیر لیکن جب وطن آتے، وطن کا وہ گوشہ جہاں وہ چہکتے اور چہکتے، گلزار ہو جاتا اور قریب قریب تمام طائران خوش نوا و خوش الحان اس کے گرد گھومتے رہتے -

اس دور میں بہت ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں یہ تو ٹھیک طور پر معلوم ہوا کہ ابتدائی تعلیم کی نوبت ہی پر شاہی بحریہ کے لئے کھلے امتحانی مقابلے کے ذریعے منتخب کیا جانے والا اب پاکستانی بحریہ کی آبرو ہے بلکہ اپنے وسیع مطالعے، اپنی طلاقت لسانی و خوش بیانی، اپنی بذلہ سنجی اور معاملہ فہمی کے گوناگوں محاسن و خصوصیات سے بمقدار وافر بہرہ ور ہے اور یکتائے روزگار نہ سہی تو نادر روزگار شخصیت ضرور ہے - بلاشبہ آصف مرحوم کو پاکستانی بحریہ کا سربراہ ہونا تھا لیکن پاکستان میں درباری سازشوں کا آغاز قائداعظم رح کی آنکھ بند ہوتے ہی ہو گیا تھا اور پھر آصف صاحب کا سربراہ ہونا تو درکنار وہ ایڈمرل یا نائب ایڈمرل بھی نہ ہو سکے - وقت سے پہلے ریٹائر کر کے ادھر اُدھر پھینکے جاتے رہے - کچھ روز مشرقی پاکستان میں بھی رہے، وہاں کے پورٹ ٹرسٹ کے چیف کی حیثیت سے، جہاں وہ ہر سال بڑے اہتمام سے ایک شاندار اور باوقار مشاعرہ کراتے اور پاک و ہند کے منتخب و مقبول شعراء کو مشرقی پاکستان بلا کے چاٹگام، ڈھاکہ، کھلنا وغیرہ میں "جنگل میں منگل" کا سماں پیدا کر دیتے - سلو

وہ عقائد و ایمان کے بڑے پختہ انسان تھے اور ادب کا بڑا ستھرا اور بلند ذوق رکھتے تھے - کراچی اور ڈھاکہ میں نہیں، جدہ میں بھی مشاعروں کے کامیاب آرگنائزر اور معلّن کی حیثیت سے برسوں ان کو یاد کیا جائے گا -

ماہر القادری رح نے جس مشاعرے میں وفات پائی، اسکو وہی (CONDUCT) کر رہے تھے اور

سلو ان کے زمانۂ وفات کی مناسبت سے اس تحریر کے بعد مرحوم کا ایک دلچسپ مضمون بھی بشکریہ سالنامہ کاکوری اخبار سے نقل کیا جاتا ہے - (تسنیم مینائی)

ماہر مرحوم کے لئے سرسری معائنے کے بعد ہی جب معالج نے تشویش ظاہر کی اور اسپتال لے جانے کو کہا تو آصف علوی مرحوم ہی تھے، جنہوں نے ان کو الف کے ساتھ مشاعرے کے برخاست کا بھی اعلان کر دیا اور پھر تین روز تک جدہ میں کہیں بھی پاک و ہند کے شعراء کی آمد کے سلسلے میں کوئی نشست نہ ہو سکی۔ حالی نے غالب کے لئے کہا تھا اور بجا کہا تھا کہ :-

سو اس کے مرنے سے مر گئی دلی

میں اُسی اعتماد سے لکھتا ہوں کہ کم سے کم چند دن کیا چند ماہ تک یہی محسوس ہو گا کہ "آصف کی رحلت سے عروس البلاد کراچی سُونا ہو گیا"

اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے ان کی اولاد کو صبر ارزانی کرے اور محبوب و محترم باپ کی خصوصیات کو اپنے اندر سمونے کی توفیق دے اور سعیدہ سلمہا، آصف سے جدائی کا زمانہ بھی اسی حیثیت و آرام سے بسر کر سکیں جیسے ان کی حیات میں کیا تھا۔

از کموڈور محمد آصف علوی

اشعار کا لطف

مولانا حالی نے اپنی مشہور تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" میں شاعری کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے جنہوں نے فرد اور معاشرے سے لے کر ملک و قوم تک کو بعض حالات میں غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری محض تفننِ طبع یا ہاؤ ہو کا نام اور بیکاروں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی قوت ہے جس کے ذریعہ عوام میں قومی اور دینی جذبے بیدار کر کے ملک و ملت میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعر ایک خاص کیفیت، جذبے یا حالات کے تحت شعر کہتا ہے اور بقول اقبال سه

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس لئے شاعر کی نوا سے دلوں کو گرمانے اور روح کو تڑپانے کا کام جس آسانی سے لیا جا سکتا ہے، وہ دھواں دھار تقریروں اور لمبے چوڑے مقالوں سے ممکن نہیں ہے تقسیم ہند سے پہلے تحریک خلافت نے برصغیر میں جو ہلچل مچائی تھی اس کی داستان پارینہ تاریخ کی کتابوں میں دفن ہو گئی مگر آج بھی یہ الفاظ بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو۔ خاص و عام کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔

شعر کی یہ خوبی کہ اسکو سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے علمیت اور قابلیت ضروری نہیں اس کی دلپسندی اور ہر دلعزیزی کا اصل سبب ہے شاہان دہلی اور اودھ کے آخری دور میں معاشرے میں مذاق سخن اس طرح رچ بس گیا تھا کہ یکے تانگے والے بھی شعر کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور برمحل شعر چسپاں کر دیا کرتے تھے کسی بات کی وضاحت کرنے یا کوئی تاثر پیدا کرنے کے لئے شعر پڑھا جائے تو شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور وہ گویا انگوٹھی میں نگینہ ہو جاتا ہے۔

۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ موجودہ ملکہ انگلستان جو اس وقت تک شہزادی تھیں اپنے شوہر کے ساتھ کینیا آئیں۔ ان کی شاہی کشتی حمبارہ آچکی تھی اور ایک برطانوی جنگی جہاز اور دو بھارتی اور دو پاکستانی بحریہ کے جہاز ان کی حفاظت اور ہمراہی کے لئے موجود تھے۔ شہزادی صاحبہ نیروبی میں سیر و تفریح میں مشغول تھیں ہر طرف جشن منایا جا رہا تھا۔ جھنڈیاں لہرا رہی تھیں، پارٹیاں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً یہ خبر گشت کرنے لگی کہ شاہ برطانیہ کا انتقال ہو گیا اور شہزادی واپس جا رہی ہیں۔ میں جب اپنے ایک افسر تعلقات عامہ کے ساتھ ایک اخبار کے آفس اس خبر کی تصدیق کرنے گیا تو معلوم ہوا کہ خبر سچ ہے میں نے کہا یہ تو بڑی بے لطفی ہوئی شاید اقبال نے ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا تھا کہ سه

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا ؎ شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اچھا شعر اسی وجہ سے ضرب المثل ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کے ان حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو عالمگیر اور ہمہ گیر ہیں۔ کبھی ایک شعر اور کبھی صرف ایک مصرعہ میں دل کو لگ جانے والی کوئی بات ایسی ہوتی ہے کہ سننے والا پھڑک اٹھتا ہے۔ کبھی ایک شعر میں ایک داستان، ایک تاریخ پوشیدہ ہوتی ہے سنہ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج میں لیکچر کے بعد سوال و جواب کا وقت آیا تو ایک طالب علم نے مجھ سے ایک نہایت نازک سوال یہ کیا۔ کہ "حصول آزادی کے بعد بھی آخر انگریز آج تک ہمارے سروں پر کیوں مسلط ہیں؟"

اس وقت پاکستان میں تینوں افواج کے سربراہ انگریز تھے اور نیوی میں تو کافی انگریز افسر موجود تھے — میں نے کہا کہ نثر میں اگر اس کا جواب دوں تو بات طولانی ہو جائے گی اور پھر دل کی دل ہی میں رہے گی اس لئے احتیاطاً اور جواباً صرف اتنا عرض کروں گا کہ سه

دفعتاً ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے ؎ الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر!

اس شعر پر ہال تالیوں سے گونج گیا اس لئے کہ صرف دو مصرعوں میں برٹش راج کی سوسالہ تاریخ کی داستان عیاں بھی تھی، اور نہاں بھی۔

دراصل شعر کا لطف اسی صورت میں ہے جب پڑھنے والا اور سننے والا جمالیاتی ذوق اور مذاق سلیم رکھتا ہو۔ ورنہ کبھی کبھی بھینس کے آگے بین والی مثل کسی خوش طبع کو سامع کی بدذوقی کا ماتم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ویسے برمحل شعر پڑھنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ بعض اوقات بے موقع بھونڈا یا عامیانہ شعر پورے ماحول کو بے مزہ کر دیتا ہے۔ لیکن عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے پڑھے لکھے باذوق حضرات کی محفلوں میں شعر گوئی کا لطف حاضرین کے کیف و سرور کا باعث ہوتا ہے۔ دوستوں کی مجلسوں، نجی تقریبات اور عام محفلوں میں زبان کا لطف اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان صرف شعر و شاعری ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تو ایسی بارونق اور پُرلطف محفلیں بہت منعقد ہوئیں لیکن انگریزی تعلیم کے فروغ اور نوجوان نسل میں سائنسی علوم سے غیر معمولی دلچسپی نے ان کی سخن سنجی اور سخن فہمی کی صلاحیتوں کو افسوس ناک حد تک متاثر کیا۔ ڈرامے۔ فلمیں۔ رنگارنگ پروگرام اور موسیقی کا شوق بڑھ گیا اور انگریزی داں طبقہ کے لئے مشاعرے، ادبی ذوق کی تسکین کے بجائے بے لطفی اور بوریت کا باعث ہونے لگے لیکن صورت حال بفضل تعالیٰ بالکل مایوس کن بھی نہیں ہے۔ اسکول اور کالجوں میں قومی زبان کی لازمی تعلیم سے پھر فروغ شعر و ادب کی فضا پیدا ہو رہی ہے اور چمن میں خوش نوایاں چمن کی نغمہ سرائی کا دورِ دل افروز جلد آنے والا ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ کاکوری اخبار)

۲: عروج زیدی (بدایونی) ثم رام پوری مرحوم

اخیر مارچ میں منہاج بھائی کا جو خط رام پور سے باطلاع کوائف حالات اور رسائل پہنچے کی رسید میں آیا، اس سے معلوم ہوا کہ عروج زیدی جو ایک مدت سے مختلف عوارض میں مبتلا تھے رحلت فرما گئے۔ پچھلے دو ایک برس میں مرحوم نے ماہر القادری مرحوم سے اپنے مراسم کی پاسداری میں فاران میں جو قلمی نوازشات فرمائیں اور وقتاً فوقتاً مراسلت اس کی بہبودی، ترقی اور ترویج کے لئے جو مفید مشورے دیئے اور دعائیں کیں، فاران کے لئے بالیقین وہ قبول ہوئیں لیکن مدیر فاران اور قارئین فاران نے ان کی صحت یابی اور زندگی کے لئے شاید دل سے دعائیں کی وہ بہت جلد اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ کچھ مہینے ہوئے ان کے صاحبزادے کا خط آیا تھا جس میں ان کی شدید علالت کی اک گونہ تفصیل تھی۔ پڑھ کر میرا دل مضطرب ہو گیا۔ میں نے ایک مختصر تحریر مزاج پرسی کی بتوسط عزیزم منہاج بھائی بھیجی تھی جس کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے مرحوم نے دو اعلیٰ پائے کی غزلیں اور ایک بلند آہنگ نعت، فاران کو عطا کی جس کی اشاعت پر حضرت عبرت صدیقی نے بنوکراچی سے ان کے نام ایک مختصر خط لکھ کر نیاز مند کو بھیج دیا تاکہ میں ان کو پہنچا دوں - میں اسی انتظار میں تھا کہ ان کی طبیعت کچھ درست ہو جائے تو یہ تحریر ان کو بھیجی جائے کہ ان کا بلاوا آگیا - جناب عبرت صدیقی کی یہ تحریر درج ذیل ہے -

عزیزی عروج زیدی بدایونی ! دعائیں
معرفت محمد اسماعیل مینائی صاحب

کلام پُر مغز و پاکیزہ فاران میں نظر نواز ہوتا رہتا ہے - میں نے رام پور، ساجد میاں اپنے بھانجے کے ذریعے آپ کو اور عزیزی ابو المجاہد کو خطوط لکھے مگر..... بہر حال آپ لوگ خوش رہیں - اب زیادہ تر میں نعت شریف لکھا کرتا ہوں، یہی زندگی کا سرمایہ ہے - فاران عزیزی ماہر القادری خلد آشیاں کی زندہ یادگار ہے کو ادارہ بڑی شان سے چلا رہا ہے - عزیزی شبنم رومانی بھی کبھی کبھی کچھ لکھ بیٹھتے ہیں - دعائیں - والسلام آپکا عبرت صدیقی، شاعر اسلام

عروج مرحوم بڑے فاضل اور صاحب ذوق انسان تھے اور اردو ادب کی خدمت کے باب میں خاص کر تقسیم ملک کے بعد کے دور میں انہوں نے بھارت میں بڑا کام کیا - بدایوں کا ماحول زیادہ ناسازگار ہو گیا تو برسوں بلکہ صدیوں کی سکونت بدل کے رام پور آگئے اور جلد ہی اپنی علمی اور ادبی و معاشرتی شائستگی اور اپنی خوش اخلاقی سے اس علاقے میں نیک نام اور معروف ہو گئے -

ماہر القادری مرحوم سے بھی ان کے مخلصانہ اور بے تکلفانہ مراسم تھے - اس نیاز مند پر بھی وہ خاص نوازش فرماتے تھے - غزل اچھی نہیں بہت اچھی کہتے تھے - تازگیٔ فکر اور چونکانے والے پیرایۂ اظہار کے ساتھ ساتھ معنویت اور مقصدیت کے اعتبار سے بھی کلام بلند ہوتا تھا - نعت میں خاص اہتمام رکھتے تھے کہ آدابِ رسالت ﷺ پورے طور پر ملحوظ و محفوظ رہیں ان کی رحلت سے فاران ایک بڑے اہم اور شفیق ہندوستانی سرپرست و معاون سے محروم ہو گیا -

اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے اور پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے -

تسنیم مینائی

شفیع اللہ خاں راز

حسنِ تغزل

مست و پُر کیف نظاروں میں رہے ہیں ہم لوگ
باخبر پھر بھی بہاروں میں رہے ہیں ہم لوگ

ہم نے دیکھے ہیں بہت گردشِ افلاک کے رنگ
مدتوں چاند ستاروں میں رہے ہیں ہم لوگ

اس سلیقے سے گزاری ہے تلاطم میں حیات
لوگ سمجھے ہیں کناروں میں رہے ہیں ہم لوگ

شورشِ فتنۂ باطل کو مٹانے کے لئے
حق پرستوں کی قطاروں میں رہے ہیں ہم لوگ

غالباً ان کو کبھی یاد تو آتے ہوں گے
جن کے ہمراہ بہاروں میں رہے ہیں ہم لوگ

ہم نے سمجھا ہے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا مزاج
عمر بھر راز شراروں میں رہے ہیں ہم لوگ

سبحان اللہ

احمد حمیدؔ

نوائے جاں سوز

تو نہیں ملتا تو مطعونِ زمانہ ہی سہی ∴ اپنے سر سارے زمانے کی خطائیں لے لوں
مجھ سے دیکھے نہیں جاتے ترے برہم گیسو ∴ آ مری جاں، تری زلفوں کی بلائیں لے لوں

ہے قربتِ انفاس یہاں کوئی نہیں ہے ∴ بس تم ہو میرے پاس یہاں کوئی نہیں ہے
آغوشِ تخیّل میں سمٹ آؤ نہ شرماؤ ∴ جُز خلوتِ احساس یہاں کوئی نہیں ہے

اک ٹوٹتے ستارے کی جیسے ہو روشنی! ∴ بس ناگہاں سی ضو ہوں ابھی ہوں ابھی نہیں
جلنے کی جو بھی چیز تھی سب جل چکی حمیدؔ ∴ بجھتے دیے کی لَو ہوں ابھی ہوں ابھی نہیں

کوششِ ضبطِ محبت کا اثر دیکھا ہے؟ ∴ اشک رک جائیں تو شق ہوتے جگر دیکھا ہے
کیا کہوں تجھ سے کہ اے ناصحِ مشفق تو نے ∴ تیز آندھی میں کبھی رقصِ شرر دیکھا ہے

غزل

محمد ظفیر الحسن

مرحلۂ شوق کا پھر کوئی بھی دشوار نہ تھا ⁂ جب مجھے ٹھوکریں کھانے میں کوئی عار نہ تھا
کون ہے جو کہ توجہ کا طلبگار نہ تھا ⁂ کون ہے وہ جو کرم کا نہیں تیرے طالب
کوئی ہمدم نہ تھا، مونس نہ تھا، غم خوار نہ تھا ⁂ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ تری یاد بنا
اس سے پہلے پہلے تو کبھی جان سے بیزار نہ تھا ⁂ بے رخی سے تری یہ حال ہوا ہے دل کا

کہتا کس منہ سے اُنہیں شاعرِ جذبات ظفیرؔ
جس کے اشعار میں جذبات کا اظہار نہ تھا

متفرق اشعار

عابد جعفری

میں تو تنہا ہوں مری ذات کا سایا کب تھا ⁂ دھوپ کا میں نے کبھی احسان اٹھایا کب تھا
سنگ میں نے کسی وحشی پہ اٹھایا کب تھا ⁂ درد بڑھتا ہے تو زخموں سے میں کرتا ہوں سوال

گل کھلے ہیں مرے زخموں کو دکھانے کے لئے ⁂ دل کو محرومئ احساس دلانے کے لئے
وعدۂ انجم و مہتاب نبا ہنے کے لئے ⁂ رات ڈھلتی ہے چلو ڈھونڈ کے جگنو لائیں
بال و پر تیز ہواؤں سے بچانے کے لئے ⁂ کچھ پرندے مرے آنگن میں اتر آئے ہیں

اپنے جذبوں کو کوئی شکل نہ دینا عابدؔ
ورنہ صورت کو بھی ترسو گے دکھانے کے لئے

خوشخبری

قارئین کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ مدیر فاران جناب اسمٰعیل احمد مینائی عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے سعودی عرب تشریف لے گئے ہیں مراجعت پر آئندہ شمارے کے اداریے میں ان سے پھر ملاقات ہو گی۔ انشاءاللہ

(مینیجر فاران)

تعارفِ کتب

درپن درپن

آج ترقی کی بدولت زمین کی طنابیں کھینچ کر دُوری اور فاصلے ختم ہو چکے ہیں - گھر بیٹھے ہر ملک و دیار کی سیر کرلی جاتی ہے اور ہر خطے کی زبان یا بولی سُن لی جاتی ہے اور دُور دراز ممالک کے مناظر دیکھکر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حال موسیقی و مصوری کا بھی ہے الفاظ سمجھ میں نہ بھی آئیں تو ساز و آہنگ کا کیف، آواز کا اتار چڑھاؤ سوز و ترنم ضرور متاثر کرتا ہے - تصویر کے خدوخال، رنگوں کا متناسب امتزاج، پس منظر، خطوط و دائرے کے ذریعے عکس وانعکاس، زاویاتی پہلوؤں سے احساسِ ابعاد، ابھار اور پھیلاؤ وغیرہ سے لطف اندوزی میں کوئی امر مانع نہیں - لیکن دوسری زبانوں کا ادب جب تک زبان سے آشنائی نہ ہو اس وقت تک نہ سمجھا جاسکتا اور نہ اس سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے اس لئے دوسری زبانوں کے ادبی شہ پاروں کا ترجمہ کیا جاتا رہا اور ہو رہا ہے۔

عموماً یہ روش عام ہے کہ کسی ایک زبان کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کر دیا جاتا ہے لیکن یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے کہ مختلف زبانوں کے عمدہ شہ پاروں کو ایک خاص معیار کے ساتھ ترجمہ کرکے یکجا کیا گیا ہو یہ کام جناب شان الحق حقی نے انجام دیا ہے انہوں نے " درپن درپن" میں عربی سے ابتداء کی اور چینی نظم پر کتاب ختم کی غالباً ان کے تحت الشعور نے حدیثِ نبی کریم " علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ہی کیوں نہ ہو"۔ سے اس آغاز و اختتام کی راہ اختیار کرائی اور کلام پاک کی سورتوں کے تراجم کے بعد حضرت علیؓ کہ بابِ مدینۃ العلم ہیں کے ارشادِ "علم" کا ترجمہ کرایا عربی کا یہ حصہ نہایت نہایت اہم ہے بالخصوص سورۂ تکویر کا ترجمہ جناب حقی کی قادرالکلامی کا بہترین نمونہ ہے باقی تراجم بھی بہت معیاری ہیں، زبان کی خوبی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

شان الحق حقی صاحب کے علمی کارناموں کی جامعیت اور تنوع کی بنیاد پر ان کی شخصیت کو ایک جامع الصفات شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے ا ن کے کارنامے اردو زبان و ادب کے ہر شعبہ میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں بعض چیزیں ان کو ورثے میں ملی ہیں اور بعض ان کے ذہن کی ایجاد ہیں - لسانیات، لغت - تنقید - تحقیق، شگفتہ نثر اور عمدہ نظم میں معتدبہ کارنامے انجام دے ہیں ان کو خوش نویسی خاکہ کشی اور جدید مصوری میں بھی دخل حاصل ہے - درپن درپن میں ان سب کا کچھ نہ کچھ

پرتو نظر آئے گا اسی طرح یہ کتاب حقّی کی پوری شخصیت کا پرتو قرار پاتی ہے۔
منظوم اعترافیہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"درپن درپن" جھلکے جھلکے ، چھوٹ بڑے چو سار
ہر دھرتی ہر بولی کے ، راگوں کی گونجار

درپن درپن آغاز ، اللہ وعلی کے قول
ساری دنیا کے ادب سے ، موتی ہیں لیے انمول

حقّی کی جے جے کار ، جو ہیں بڑے فن کار
درپن درپن شعر بھرے ، چھان کے سب سنسار

سیّد قدرت نقوی

بقیہ ذکر غالب

اور بعض خطوط اور فارسی نثریں بھی آخر میں بڑھادیں۔ اس مجموعے کا نام انھوں نے "باغِ دو در" تجویز کیا تھا۔ اس کا حصۂ نظم اورینٹل کالج میگزین (لاہور) کے اگست ۱۹۶۰ء کے اور حصۂ نثر اگست ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ نثری حصے میں متعدد خط منشی تفضل حسین خاں کے نام بھی ہیں۔ ان میں سے دوسرے خط میں لکھتے ہیں[لہ]

ایں بار طالع یار خان کہ دوست دیرینہ	اب کی مرتبہ طالع یار خاں نے کہ میرے
منست، بار گرانے بر دوش من	دیرینہ دوست ہیں، ایک بارگراں میرے
نہاد، بپارسی ترجمہ کردن ہندی	کندھوں پر رکھ دیا، یعنی مجھ سے کہا کہ اردو

لہ اورینٹل کالج میگزین (لاہور) اگست ۱۹۶۱ء ص ۱۳۹

اختر شاہجہاں پوری

غزلیں

بھارت میں اردو غزل کا پرچم آج بھی ہمیشہ کی طرح سربلند ہے، نئے لکھنے والے فن عروض کی پابندیوں سے بے نیاز سہی لیکن حسن تغزل کی نزاکتوں اور لطافتوں سے ان کے افکار صرف مملو ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ جناب اختر شاہ جہاں پوری کی یہ دو غزلیں میرے عزیز دوست اور بھارت میں فاران کے سب سے فعال خادم و مخدوم اور ماہر القادری مرحوم کے مایہ ناز تلمیذ۔ جناب شوق ماہری کی وساطت سے مجھ تک پہنچی ہیں۔

ان میں خاص طور پر دوسری غزل کے جملہ ابیات کا لہجہ اور آہنگ سے ایک زندہ اور فعال ذہن کا سراغ ملتا ہے جو بھارت کے اہم سیاسی و سماجی مسائل کی اہمیت اور ان کے عاجلانہ حل کی ضرورت سے پوری طرح باخبر ہے، یہ رجحان اردو غزل کے مستقبل کے لئے صحت بخش بھی ہے اور اسکو نیا روپ بھی عطا کرتا ہے، فاران شوق ماہری اور حضرت اختر شاہ جہاں پوری کا شکر گزار ہے اور حضرت اختر کو یہ پیام دیتا ہے کہ سو خدا جنوں کا ترے سلسلہ دراز کرے

تسنیم مینائی

---

(۱)

مجھکو منظور مدّعی ہونا ✽ ہے مگر شرط منصفی ہونا

کمتری کا یقیں دلاتا ہے ✽ خود کو احساس برتری ہونا

تیرگی کے پہاڑ سے بہتر ✽ ایک جگنو کی روشنی ہونا

کتنا بے فکر زادِ راہ سے ہوں ٭ کام آیا — مرا سنخی ہونا

طبعِ نازک پہ ہے گراں اخترؔ
میری آنکھوں کا شبنمی ہونا

(۲)

نمودِ صبح کا منظر تو بادلوں میں ہے ٭ اسی سبب سے ہر اک شخص وسوسوں میں ہے
زباں سے کہہ گئے کیا کچھ نہ لوگ محفل میں ٭ دلوں کی بات ابھی تک مگر دلوں میں ہے
فضا میں اڑتے پرندے یقین رکھتے ہیں ٭ کہ اُن کا رزق تو خود انکے بازوؤں میں ہے
نہ جانے کتنے مسائل کا حل نکل آیا ٭ مگر زمینِ وطن اب بھی حادثوں میں ہے
چلو نمائشِ شیشہ گراں سے دُور چلیں ٭ کہ یہ تو سنگ طرازوں کی یورشوں میں ہے
کسے یہ ہوش کہ مہماں نوازیاں بھی کرے ٭ ہر ایک شخص یہاں پر مسافروں میں ہے

ستم ظریفیٔ حالات کیا کہوں اخترؔ
کہ جسکا قتل ہوا، وہ بھی قاتلوں میں ہے

قطعہ

بہت آسان ہے تیری گلی میں مر کے جی اٹھنا ٭ مگر مشکل یہ ہے تیری گلی مشکل سے ملتی ہے
شعورِ دوستی کیا چیز ہے اس دور میں روحیؔ ٭ سلیقہ جس میں ہو وہ دشمنی مشکل سے ملتی ہے

—— پیرزادہ روحیؔ قادری

کلیم ضیاء (بمبئی)

غزل

یہ غزل بمبئی (گجرات) سے آئی ہے ۔ شاعر سے راقم الحروف واقف نہیں ۔ بایں ہمہ ان کی فاران نوازی کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں
تسنیم مینائی

روح پر منڈھ گئیں شعلوں کی ردائیں کیا کیا ∴ وقت نے پھونک دیں افسوس چتائیں کیا کیا

بس کہ تا حدِّ نظر قہر نظر آتا ہے ∴ خون برساتی ہیں بستی پہ ہوائیں کیا کیا

جلتے گھر، اٹھتا دھواں آگ اگلتا ماحول ∴ دے گئی ہیں ہمیں سوغات گھٹائیں کیا کیا

تن پہ کپڑے نہ رہے، کھنچ گیا رگ رگ سے لہو ∴ ہو جو ماحول لٹیرا تو بچائیں کیا کیا

وہ جو اپنے تھے وہی غیر سے بدتر نکلے ∴ ہم نے مانگی تھیں محبت میں دعائیں کیا کیا

سب اڑاتے ہیں ضیاءؔ میری کہانی کا مذاق
میں سناتا ہوں زمانے کو کتھائیں کیا کیا

---

(۲)

ندیم نیازی (عیسیٰ خیلوی)

افکار بکے اور قلم کار بکے ہیں ∴ ہر دور میں یوسف سرِ بازار بکے ہیں

موسم کا سحر دے گا ہر آنکھ کو دھوکا ∴ نرخِ گل و لالہ پہ بہت خار بکے ہیں

عیسیٰ نفسی اپنی جگہ خود بھی ہے دولت ∴ کچھ نقدِ شفا دیکھ کے بیمار بکے ہیں

تاجر سرِ سودائے محبت نہیں رکھتے ∴ الفت کی دو کانوں پہ خریدار بکے ہیں

حرف آئے گا اُس محفلِ معیارِ نظر پر ∴ اک مول جہاں ظلمت و انوار بکے ہیں

سمیع جمالؔ ایم۔اے

غزل

جناب سمیع جمال (جن کی ایک غزل پہلے بھی فاران میں شائع ہو چکی ہے) کی نوازش ہے کہ فاران کو کلام بھیجتے ہیں - کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شعر کہنے کی خاص کر غزل کہنے کی صلاحیت ہے اور لہجہ چونکا دینے والا ہے فکر میں تازگی بھی پائی جاتی ہے لیکن نام نہاد غزل جدید کے علمبردار، فکر و فن کی جن قدروں کو اپنے عجز اظہار کے اخفا کے لئے نظر انداز کر دیتے ہیں انہیں کے اتباع کا داعیہ بظاہر جناب سمیع جمال کے ذہن میں کلبلاتا رہتا ہے اُن کے بہی خواہ کی حیثیت سے میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ کسی ذی استعداد مقبول و معروف شاعر کو اپنا کلام دکھا لیا کریں، تابش دہلوی، محشر بدایونی شور علیگ، راغب مراد آبادی ان کے نزدیک ہی رہتے ہیں۔ (تسنیم مینائی)

مجھ کو اس طرح بھی سزا دینا　　٭　　نام لکھ کر مرا مٹا دینا

جب بھی آئے بہار کا موسم　　٭　　پھول گلدان میں سجا دینا

جب نکلنا تلاش میں اپنی　　٭　　مجھ کو بھی دربدر صدا دینا

ہاں بجھا کر چراغِ ہستی کو　　٭　　اک دیا راہ میں جلا دینا

مجھ کو محروم دوستی رکھنا
خود کو ساتھی جمالؔ سا دینا